ہاں تم مجھے قبول ہو
ناولٹ
شازیہ چودھری

شازیہ چوہدری

ناولٹ

"وہ سنیں۔ ابھی کتنا سفر اور باقی ہے؟" آسمان سیاہ گھٹاؤں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چھما چھم موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ اردگرد دھان کی فصلوں میں کئی انچ تک پانی بھر گیا تھا۔ شدید برفیلے جھکڑوں کی زد میں آئی فصل کی نرم و نازک شاخوں کے سرے زمین بوس ہونے کے بعد دوسرے ہی لمحے مخالف سمت سے وار کرنے والے طوفانی تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونے کو ایک لحظے کو پھر تن جاتے اور اگلی ساعت بے بسی و بے اختیاری کی انتہائی حالت میں دوبارہ "سپردگی" پر مجبور ہو جاتے۔ رات سر پر تھی۔ اردگرد کسی چرند پرند ذی نفس کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس قدر شدید بوچھاڑ میں نیم پختہ سڑک پر چھوٹی سی نیلی سوزوکی راستہ بنا کر آگے بڑھ رہی تھی تو اس میں خدا کی قدرت کے بعد سراسر ڈرائیو کرنے والے بندے کا کمال تھا۔

منزل کا ابھی دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ گاڑی میں چھائے اس قدر ہولناک سناٹے بیرونی ماحول کی حد درجہ طوفان خیزی اور دل میں امڈ کر آنے والے شدید پُرخوف' ہراساں کر دینے والے اندیشوں نے بالآخر اسے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ فی الوقت "ناک" سے زیادہ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ سوچ کڑا کر کے وہ اپنی اندرونی اضطراری کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کا منجمد چہرا دیکھتے ہوئے بے بس سی ہو کر بول پڑی تھی۔

کتنی ہی دیر ادھر سے جواب نہیں آیا۔

وہ بڑے سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستہ بری طرح جل تھل ہو رہا تھا۔ سوزوکی پانیوں کا سینہ چیرتے ہوئے رک رک کر چل رہی تھی۔ وقفے وقفے سے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"شام گہری پڑ گئی ہے۔ موسم اس قدر خراب ہو رہا ہے۔ اس گاڑی کے ذریعے اتنا مشکل راستہ کیسے طے ہو گا؟"

وہ زیادہ دیر تک اپنی تشویش پوشیدہ نہیں رکھ سکی تھی۔ اپنے اندر مچلتے پُرہول خدشات سے فرار کے

لیے وہ اس کی سرد مہری محسوس کرنے کے باوجود دوبارہ مخاطب ہوئی۔

"تو آپ اپنے والد محترم کی لینڈ کروزر میں آجاتیں میرے لیے تو عین مسرت کا باعث تھا۔ اس حد درجہ بیزار کن ہمراہی سے مجھے نجات مل جاتی۔ اس ناخوشگوار ترین سفر کا انجام میں آپ سے کہیں زیادہ شدت سے جلد از جلد چاہتا ہوں۔" حد درجہ خشک اور کھردرے لب و لہجے میں جواب آیا تھا۔

وہ احساس توہین سے لمحہ بھر کو سُن سی بیٹھی رہ گئی۔ اس نے جیسے پتھر سے کھینچ مارے تھے۔ کیا اعلا درجے کی بے مہری اور بے کانگی کا مظاہرہ تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر ایک. چھبھلاتی سی نگاہ اس پر ڈال کر رخ موڑ کر کھڑکی کے شیشے سے موسم کی جنوں خیزی ملاحظہ کرنے لگی۔ اس کی شریانوں میں خون کھول رہا تھا۔

"مما صحیح کہتی ہیں۔ یہ دیہاتی لوگ سرے سے جنگلی، وحشی اور بد تہذیب ہوتے ہیں۔" وہ اپنے اندر کے دہکتے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اپنا دھیان بٹانے کو مما کی باتیں ذہن میں دہرانے لگی۔

بارش کی تیز رفتاری ژالہ باری کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اولے پتھروں کی طرح ونڈ اسکرین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ طوفانی جھکڑوں میں لحہ بہ لحہ تیزی آتی جا رہی تھی۔ کسی لمحہ تو یہی لگتا تھا کہ یہ ننھی منی سی نیلی سوزوکی بھی کسی تن "آب و ہوا" کی اس شوریدہ سری پر آمادہ غضبناک شدتوں سے ہار کر اڑتی چلی جائے گی۔

"اب کیا ہو گا؟" خاموشی کا دورانیہ ماحول سے سوا تر سراسیمگی پیدا کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے اندر اٹھنے والی غصیلی لہروں کو دبا کر تشویش بھرے انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ ہونٹ بھینچ کر اردگرد سے قطعی بے نیاز پتھریلے تاثرات میں لپٹے چہرے کے ساتھ پورا دھیان ڈرائیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ مضبوط سانولے مردانہ ہاتھ اسٹیرنگ وہیل سے نبرد آزما تھے۔ اس کی مغرور کھڑی ناک کے نیچے بالائی لب پر آویزاں اس کی گھنی سیاہ مونچھوں پر نظر پڑتے ہی اس کے حاکمانہ مزاج اور سخت دلی کا احساس دل میں جاں گزیں ہو جاتا تھا۔ ہمہ وقت فراخ پیشانی کا احاطہ کیے رکھنے والی ماتھے کی شکن اس کے "آتش فشانی" موڈ کی واضح عکاس تھی۔ وہ ہمیشہ ہی ایک جارحانہ سے انداز میں نظر آتا تھا۔ کم از کم زرمل کو تو یونہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کا خون چھلکانے کو آمادہ نچلا ہونٹ اس کی ذات کی بے رحمی اور سفاکی کا گویا اعلانیہ اظہار تھا۔

اور آنکھیں۔ اف خدایا۔

ان برفیلی چٹانوں کی سی برودت اور سختی لیے ہوئے چمکیلی سیاہ آنکھوں میں اس قدر منجمد کر ڈالنے والا اکھڑ پن جھلکتا تھا کہ مد مقابل ایک کے بعد دوسری بار نظر ملاتے ہوئے گھبرا جاتا تھا۔ اور لب و لہجہ تو اس سے سوا تر تھا۔ ایک دم قطعی اور چھا جانے والا۔ اور زرمل سے بات کرتے ہوئے تو اس میں زمانے بھر کی خشکی، ترشی اور کھردرا پن شامل ہو جاتا تھا۔

"تماشا ملاحظہ کیجئے۔ کچھ کر سکتی ہیں تو بصد شوق کیجئے اور کیا ہو سکتا ہے۔" زہر سے بجھے ہوئے تیر کس قدر ٹھنڈے اور پرسکون انداز میں اس کے سینے میں اتارے گئے تھے۔

"ہونہہ!" اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔ کب یہ عذاب ختم ہو گا۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔" وہ کلس کر رہ گئی۔

"تم کیا آپ سیدھے طریقے سے بات کا جواب دینے سے ناواقف ہیں؟" ایک تو پرہول طویل سفر اوپر سے اس کی حد درجہ بے نیازی اور کھردرا پن۔ اس کی نازک مزاجی زیادہ دیر تک صبر و برداشت کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔ وہ ایک دم جھنجلا کر جیسے اس پر الٹ پڑی تھی۔

وہ ایک دم سے غضبناک ہو کر اس کی طرف مڑا۔

"شٹ اپ۔ میں اس طرح کا لب و لہجہ برداشت نہیں کیا کرتا۔ اپنی زبان پر قابو رکھیں۔ ورنہ کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینکنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگاؤں گا۔"

وہ بھڑک کر بولا اور زرمل کا ایک لمحے کو جیسے خون خشک ہو گیا۔ کس قدر دھانسو اور جابرانہ انداز تھا۔ وہ لب بستہ بیٹھی رہ گئی۔

"عورتیں ان کے نزدیک گائے بھینس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتیں۔ بلا کے سخت گیر، خود پسند اور سرکش ہوتے ہیں یہ دیہاتی لوگ۔" مما کی بتائی ہوئی بات اسے سو فیصد درست لگی۔

"اف خدایا۔ میں کیا کروں۔" اسے اپنی بے چارگی پر رونا آنے لگا۔

اس کا بس چلتا تو خود نواب صاحب کو دھکا دے کر گاڑی اڑاتے ہوئے واپس شہر "شہزاد ولا" لوٹ جاتی اپنے گھر۔

"اف دادا جان! آپ کو بھی اس خراب موسم میں ہی بلاوا بھیجنا تھا۔" اندر اٹھتے ابال کو کہیں تو راہ ملنا ہی تھی۔ "نہ آپ اس قدر ایمرجنسی میں بلاتے اور نہ مجھے اس ناپسندیدہ شخص کے ساتھ یہ قیامت خیز گھڑیاں گزارنا پڑتیں۔"

وہ بہت کوفت بھرے انداز میں سر جھٹکتے ہوئے دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی جہاں تیز شور و سرد بوچھاڑ لیے آندھی طوفان کے ریلوں سے برسرپیکار اس ہی کی طرح بے بسی سے جھکتے بکھرتے ٹوٹتے شجر و حجر کے ماسوا کچھ نہ تھا۔ رات کی سیاہی آہستہ آہستہ ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی تھی۔ ہاں ایک شے جس کے آگے وہ بھی شکست خوردہ ہو گئی تھی وہ تھی، آسمان سے چھاجوں چھاج برستی بوچھاڑ جس پر رات کی تاریکی کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ بالکل زرمل کی طرح۔ وہ بھی تو اس ناہنجار ابر آلود موسم کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔ اپنی نازک طبعی اور اس کے خلاف شدید غم و غصے کا برملا اظہار فی الوقت ترک کرنا پڑا تھا۔ کہ اور کرتی بھی کیا۔ اس وقت اس کے رحم و کرم پر جو تھی۔ جانتی تھی وہ لحاظ اور مروت کی حدوں سے کوسوں دور ہے۔ جو کہتا ہے اس پر عمل درآمد میں چنداں تاخیر نہیں کرتا۔

سو ہونٹ کاٹتے چپکی ہو رہی۔ تاہم دل کے تھال میں ڈھیر سارے وسوسے اور اندیشے سکوں کی طرح گرتے چلے جا رہے تھے۔

معاً "گاڑی کا انجن غراتے ہوئے بند ہو گیا۔

"شاید ٹائر پھنس گیا ہے کہیں۔" کتنی ہی دیر اندرونی آلات میں سر کھپانے کے بعد وہ بڑبڑاتے ہوئے سیدھا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"اللہ خیر۔ یہ ایک نئی مصیبت۔" خوف سے ڈوبتا ہوا دل مزید سکڑنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر باہر کھٹر پٹر کرنے کے بعد وہ واپس آیا تو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کا بادامی شلوار کرتا بری طرح بھیگ گیا تھا۔ گرم جیکٹ کے باعث بہر حال کچھ بچاؤ ہو گیا تھا۔ بال بھیگ کر پیشانی سے چپک رہے تھے

"اب کیا ہو گا؟" اس نے ہول کر اسے دیکھا۔ جو دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے خود کو گرمائش پہنچانے کی سعی کر رہا تھا۔

وہ کچھ نہ بولا۔ نئے سرے سے کلچ اور گیئر کی "کارکردگی" کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی چھلک رہی تھی۔ جوان، حسین لڑکی کا ساتھ تھا۔ رات کا اندھیرا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ اوپر سے ایسا خطرناک طوفانی موسم دور دور تک کسی پناہ گاہ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسے میں خدا کے بعد اس گاڑی کا ہی کچھ آسرا تھا، یہ بھی جواب دے گئی تو کیا بنے گا۔ بہت بھاری ذمہ داری تھی اس پر۔ اپنی ذات کی بات ہوتی تو اس کو رتی برابر بھی پروانہ ہوتی۔ وہ کسی طرح بھی اس خطرناک صورت حال سے نپٹ سکتا تھا۔ مگر زرمل کی موجودگی نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ لڑکی ذات تھی اس ویرانے میں اگر صورتحال قابو سے باہر ہو جاتی تو۔

"کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے؟" اس کی تشویش فطری تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہو بھی گئی ہو تو آپ کیا خدمات پیش کر سکتی ہیں اس سلسلے میں؟"

طنز میں لپٹا بیزار کن جواب موصول ہوا تھا۔

وہ کڑھ کر رہ گئی۔

"اگر جو ایسی آفت نہ پڑتی تو کب کی دو حرف بھیج کر اپنی راہ لیتی۔" وہ جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئی تھی۔

"تو آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟" وہ تلملا کر پہلو بدلتے ہوئے کہہ گئی۔

"وظیفہ کر رہا ہوں۔ جس کے فیض سے آپ کی والدہ محترمہ کا بھجوایا ہوا ہیلی کاپٹر مدد کو آن پہنچے گا۔" وہ جیسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے رخ موڑ گئی۔

"مجھ پر کس حساب میں برس رہے ہیں۔ میں نے چلتے وقت بھی کہا تھا کہ اس کھٹارا گاڑی کو رہنے دیں۔ پاپا کی جیپ لے لیتے ہیں۔" وہ زیادہ دیر تک اپنے غیض پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ سو بالآخر بگڑنے لگی۔

"مگر آپ کے سر میں جانے کون سا سودا سوار تھا۔ لے کے مجھے بھی خوار کر ڈالا۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے برہمی سے سر جھٹک رہی تھی۔ اس کی برہمی سراسر ردعمل کے طور پر نمایاں ہوئی تھی۔

عباس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے ایک دہکتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

"دادا جان کی زندگی کا سوال نہ ہوتا اور امی اس قدر مجبور نہ کرتیں تو اتنا لمبا سفر تو کجا آپ کے ساتھ ایک قدم کا ساتھ بھی گوارا نہ کرتا۔ خود کو تو کیا اپنی گاڑی کو بھی آپ کے سائے سے دور رکھتا۔ اب بھی گھر پہنچ کر گاڑی اچھی طرح دھلواؤں گا اندر باہر سے۔ میں ناپسندیدہ لوگوں کی مہک بھی اپنے اردگرد برداشت نہیں کرتا۔"

اس کے سرد و سپاٹ چہرے سے اس کی ذات سے حد درجہ بیزاری کے آثار واضح جھلک رہے تھے۔

"مجھے بھی اس قدر مجبوری نہ ہوتی تو آپ کا ساتھ کبھی گوارا نہ کرتی۔" وہ بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ احساس ذلت سے چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"اور آپ کس درجہ خود پرست اور کم ظرف انسان ہیں کہ اتنے سے احسان کو بار بار جتلا کر خود کو مزید ہلکا کر رہے ہیں۔" وہ ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے طیش سے کہہ رہی تھی۔

"شٹ اپ!" وہ یکدم مشتعل ہو کر دھاڑا۔ "میں اپنی ذات پر بے جا حرف گیری قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر برداشت کیا کرتے ہیں؟" وہ چبا چبا کر بولتے ہوئے تیکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "ایک لسٹ بنا دیجئے اس کی تاکہ مجھے یادداشت میں محفوظ کرنے میں آسانی رہے۔" استہزائیہ گویا ہوئی تھی۔

"کیوں؟ آپ میری کیا لگتی ہیں۔ جس سے اس درجہ ذاتی معاملے کو شیئر کروں؟" اس نے براہ راست اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے درشتی سے استفسار کیا۔

اس کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ وہ اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

واقعی کیا رشتہ تھا اس کا جو خوامخواہ پرسنل ہو رہی تھی۔

ایک استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔ تایا زاد ہونے کے ناتے رشتہ بنتا تھا۔

اور۔

اور ایک وہ نام نہاد رشتہ تھا جو کاغذوں میں بند پڑا تھا۔

مگر دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کسی بھی رشتے سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"مجھے آپ کی ذات سے رتی بھر دلچسپی نہیں آپ کی پسند وناپسند سے مجھے کیا غرض۔"

وہ تندی سے کہہ کر باہر دیکھنے لگی جہاں اب اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ برستی بوندوں کے ساتھ ساتھ تو اب گرج چمک بھی گویا حصہ بٹانے تشریف لے آئی تھی۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک دل دہلائے دے رہی تھی۔ اسی لمحے ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ شاید کہیں بجلی گری تھی۔ آواز اس درجہ ہولناک تھی کہ وہ ایک چیخ مار کر اسٹیئرنگ سے الجھتے اس کے مضبوط ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ گئی۔

"اپنے آپ میں رہو۔" دوسرا لمحہ قیامت کا تھا۔ وہ

ایک لمحے کو تو جیسے حق دق بیٹھا رہ گیا تھا پھر دوسرے لمحے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے کہتا دوبارہ چابی اگنیشن میں لگانے لگا۔

اور وہ بیک وقت شرم اور غیض سے منجمد سی بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس کا فعل قطعی بے اختیاری اور فطری تھا۔ اس نے کون سا جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھنے لگی۔

"کک۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟" غصے و شرم سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ "آ۔۔۔ آپ نے کیا سمجھ کر مجھ سے یہ بات کہی۔" وہ آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ "ارے میں تو کبھی لعنت بھی نہ بھیجوں تم پر۔ سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ بڑے پارسا بنے پھرتے ہو۔ یار لوگ کہتے ہیں سر عباس حیدر اپنے گرد "امیٹی گرلز" پرفیوم کا چھڑکاؤ کیے رکھتے ہیں ہمہ وقت۔ ہونہہ سب بکواس ایک دم۔ اسی باپ کے بیٹے ہو ناں آخر جس نے تمام تر ریکارڈ توڑتے ہوئے چار چار شادیاں رچا رکھی ہیں۔ اسی خاندان کے ہو ناں آخر' جہاں تین تین چار چار شادیاں کرنا ایک مقبول عام اور پسندیدہ رواج سمجھا جاتا ہے۔" ممی کس قدر درست تجزیہ کرتی ہیں اس خاندان کا۔ نفس کا مارا ہوا' جنگلی اور حریص۔ عورت اور دولت کے پیچھے لپکنے والا خاندان۔ یہ گاؤں کے لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ بظاہر معصوم و سادہ بباطن گنوں کے پورے۔"

وہ جیسے اپنی سوچ پر مہر تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ خفت سے اس کا برا حال تھا۔ خود اپنی بزدلی پر بھی رہ رہ کر ابال اٹھ رہے تھے۔

"ذرا سی بجلی ہی تو گری تھی۔ مجھ پر تو نہیں گری تھی ناں۔ کیا ضرورت تھی اس کے بے رحم اور کٹھور وجود کا سہارا تلاش کرنے کی۔ اس کی مضبوط پناہ ڈھونڈنے کی۔" وہ خود پر لعنت ملامت کر رہی تھی۔

حسب سابق اس نے زرمل کے واویلے پر کان دھرنے کی زحمت نہیں کی۔ بے نیاز بنا نچلا ہونٹ

دباتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ صد شکر کہ اس کا انجن بالآخر اپنی ضد چھوڑ کر بیدار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ چند ایک جھٹکوں کے بعد گاڑی آگے کھسکنے لگی تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

اس قدر لمبا راستہ تھا۔ اسے سفر کی طوالت اور سنگین قسم کی خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی مگر کیا کرتی۔ وہ تو ضروری سے ضروری سوال کا جواب دینے کا بھی روادار نظر نہیں آ رہا تھا۔

یکایک اسے احساس ہوا اس کا پیٹ بالکل خالی ہے۔ دوپہر کو وہ لوگ چلے تھے اور اس نے صبح ناشتے میں ایک سلائس اور چائے کا ایک کپ لیا تھا چلتے وقت کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہوا۔ اور اب اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔

"سنیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ تسلیم کرتی تھی کہ اس کی برداشت بہت کم تھی۔ خصوصاً "بھوک نیند اور غصہ برداشت کرنے میں وہ ازل سے ناکام رہی تھی۔ سو اس کی تلخ و ترش بھلا کر پھر اسے مخاطب کر بیٹھی۔

"آپ کے نان نفقے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔" کس قدر دو ٹوک انداز میں برجستہ جواب لڑھکایا گیا تھا۔ گہرائی لیے ہوئے اس معنی خیز لہجے میں کیا کچھ نہ تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی اتنی نادان تو نہیں تھی اب۔ ایک لمحے کو وہ خجالت سے سرخ پڑ گئی۔

"نعمتوں کے خوان تو سجانے سے رہا۔ کھانے کے لیے میرے سر کے علاوہ فی الوقت اور کچھ دستیاب نہیں ہے۔"

اس کے اس قدر بے مروت انداز پر وہ پوری جان سے سلگ کر رہ گئی۔

"میں اس قدر کڑوی اور زہریلی ڈش کھانا پسند نہیں کرتی۔" وہ بمشکل تمام اپنے کھولتے ہوئے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے بظاہر بڑے تحمل سے گویا ہوئی۔

"ڈرنک کے طور پر کھیتوں میں بھرا پانی بھی موجود ہے۔ جائیے اور نوش جاں کیجئے۔" دوسری طرف حد درجہ اطمینان کی کیفیت تھی۔

وہ بھی جی بھر کر زچ کر رہا تھا۔

"سنئے آپ کو مجھ سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" وہ بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتی ہوئی غیض بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "آپ ہوتے کون ہیں میرا مذاق اڑانے والے۔" وہ بل کھا کر تنتناتے ہوئے کہہ بیٹھی۔

"اپنا منہ سنبھال کر بات کیا کرو مجھ سے، سمجھیں!" وہ غرا کر الٹ پڑا۔

وہ خائف سی ہو کر لاچاری سے انگلیاں مروڑتے ہوئے سامنے متوجہ ہو گئی۔ اس کی دھونس، بختی اور اذیت بھری رفاقت برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔

"گاؤں کے لوگوں کو رشتوں کی پہچان بالکل نہیں ہوتی۔ کیا بہن اور کیا بیٹی اور کیا ماں۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے اور جوان کے آگے ڈٹ جائے اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالتے ہیں۔ ان کے اندر کے ننگے بھوکے وحشی جذبے کسی بھی قسم کی تہذیب و شرافت سے ماورا ہوتے ہیں۔ بس پیٹ بھرا ہو۔ حکم بجالانے والوں کی قطاریں ہوں۔ تو ان جنگلی مرد سورماؤں کے بھڑکتے کلیجے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔"

مما کی بتائی ہوئی باتیں رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ جو اسے حرف بہ حرف سچ لگ رہی تھیں۔

ژالہ باری ایک دم تیز ہو گئی۔ اس قدر تیز کہ گاڑی چلانا دشوار تر ہوتا گیا۔ ونڈ اسکرین موٹی موٹی برستی بوندوں اور پتھر کی طرح ایک تواتر سے گرتے اولوں کی بوچھاڑ سے بری طرح دھندلا رہی تھی۔ وہ محض اندازے سے گاڑی چلا رہا تھا۔ چلا بھی کہاں رہا تھا چلانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ نیم پختہ کچی پکی سڑک کی گیلی چکنی مٹی اور تاحدِ نظر پھیلا پانی کا دریا ڈرائیونگ میں الگ رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اوپر سے گرجتے بادل اور کڑکتی بجلیاں اور ارد گرد پھیلی گمبھیر پراسرار تاریکی۔

زرمل کی ساری طراری دھری کی دھری رہ گئی۔ حقیقتاً "اپنا وجود موت سے بہت قریب لگنے لگا۔ کتنی

دل ورا انجانے خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ سہمی بیٹھی رہی پھر سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ روہانسی ہو کر مجبوراً پھر اس کی طرف پلٹی۔

"عباس صاحب! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے خوف سے میرا دل بند ہو جائے گا۔" وہ بہت روہانسی لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ عباس نے ایک تیکھی ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

اس کی گلاب ایسی دہکتی رنگت میں زردیاں گھل رہی تھیں۔ چہرے پر اتنی سردی میں بھی پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ اس کا نازک دلفریب سراپا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ اس درجے سراسیمہ اور بے اوسان ہو رہی تھی کہ عباس کو اپنے اندر امڈتا جلال دبانا پڑ گیا۔ اس کے لیے تمام تر منتقمانہ اور سنگدلانہ جذبات رکھنے کے باوجود وہ بہرحال انسان تھا۔ ایک کمزور بے بس اور مصیبت میں گھرے بندے کی تشفی کے لیے اور کچھ نہ سہی ہمدردی کے چند بول تو بولے ہی جا سکتے تھے۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں گاڑی سے اتر کر دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی ٹھکانہ مل جائے سر چھپانے کو۔"

وہ خلاف عادت قدرے نرمی سے بولا اور پھر اس کے کچھ بولنے سے پیشتر گاڑی بند کر کے نیچے اتر گیا۔

"جانے کہاں گئے ہیں۔ اس قدر طوفانی موسم میں۔" اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھیگتا کانپتا گاڑی میں آیا تو اس کے ہاتھوں میں تازہ صحت مند قسم کے سات آٹھ مالٹے دبے ہوئے تھے۔ عجلت میں توڑنے کے باعث کچھ کی ٹہنیاں بھی پتوں سمیت ساتھ لٹک رہی تھیں۔

"سڑک کے کنارے مالٹوں کا باغ لگا ہوا ہے ادھر۔" پہلی بار اس نے اپنی طرف سے وضاحت دی تھی۔ "فی الوقت بھوک مٹانے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں مل سکتا۔ باغ کے شمالی کونے کی جانب کسی گاؤں کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ کوشش کر کے تھوڑی دور تک گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ خدا کرے واقعی کوئی گاؤں ہی ہو۔ اب مزید سفر ناممکن ہو گیا ہے صبح ہی کچھ ہو سکے گا۔"

اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"اور رات!" اس نے بدحواس ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کہاں گزاریں گے؟"

"گاؤں کے کسی گھر میں پناہ لے لیں گے۔ دیہاتی لوگ اتنے تو مہمان نواز ہوتے ہی ہیں۔" آخر میں وہ طنز کرنے سے باز نہ رہ سکا۔

زرمل جیسے کانوں میں تیل ڈال کر ڈیش بورڈ پر سے ایک مالٹا اٹھا کر چھیلنے لگی۔ جانے بھوک کی شدت تھی یا واقعی زمین کی تاثیر تھی کہ یہ مالٹے اسے بہت میٹھے، رس بھرے اور خوش ذائقہ لگے۔ وہ جو خوب صورت سی پلیٹ میں رکھی صاف ستھری سیاہ مرچ اور نمک کے چھڑکاؤ کے ہمراہ مالٹے کی قاشیں بڑی نفاست سے کانٹے سے کھانے کی عادی تھی آج مالٹے کے رس سے سنے ہاتھوں سے کس قدر رغبت سے سارا نخرا اور طنطنہ بھول کر خود چھیل کر صاف کر کے ہاتھ کی اوک پر رکھ کر کھا رہی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے ساری۔

عباس نے بھی دو مالٹے کھائے۔ چھلکے وغیرہ پھینکنے کے لیے جب اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا تو بھیگی ہوا کا تند و تیز جھونکا زرمل کو بری طرح کپکپا گیا۔

کسی طرح گھسٹ گھسٹا کے گاڑی کا بوڑھا ہانپتا کانپتا انجن باغ کے شمالی کونے تک پہنچ ہی گیا اور پھر جیسے کھانستا ہوا دم توڑ گیا۔

"آپ لاک لگا کر گاڑی میں بیٹھیں۔ میں گاؤں کے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ سامنے کچھ دور مکانات وغیرہ نظر آ رہے ہیں۔" وہ اسے ہدایت اور وضاحت کرتا ہوا پھر گاڑی سے باہر نکل گیا۔

پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی بھی موجود تھے۔ اس کے اشارے پر وہ جی کڑا کر کے نیچے اتر آئی۔ سردی کی شدت سے رگوں میں خون جمتا محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔" چکنی مٹی اس کے پیروں تلے پھسلتی محسوس ہو رہی تھی۔ کچا راستہ تاحد نظر تالاب بنا دکھائی دے رہا تھا۔

"تو کیا سر پر اٹھا لوں اب؟" وہ بھنا کر مڑتے ہوئے

اسے ڈانٹنے لگا۔ زرمل کی جان جل کر رہ گئی۔

"خود تو کس مزے سے اپنے کچھ ہوتے سوتوں سے باتیں بگھار رہے ہیں اور ...." وہ کھسیا کر دل ہی دل میں اسے لتاڑنے لگی۔

گرتے پڑتے بالآخر گھر کی دہلیز پر پہنچ ہی گئے۔

"ماسی' او ماسی! خیر سے پروہنے آگئے ہیں۔" غلام رسول نے سر پر سے چھاتا جھٹکتے ہوئے زنانہ کمرے کے پاس آکر اونچی آواز میں ہانک لگائی تھی۔

"سو بسم اللہ۔ رب کل دیاں خیراں کرے۔" ایک صحت مند سی اماں ٹائپ خاتون نے بیٹھک میں داخل ہو کر بلاتوقف زرمل کو گلے لگا کر دو تین بار بھینچنے کی رسم پوری کرنے کے بعد عباس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ انداز یوں تھا جیسے اپنے کسی جان سے پیارے کی آمد ہوئی ہو۔

ماسی کے پیچھے اس کی بہو اور غلام رسول کی بیوی جھجکتی شرماتی اس کے قریب آگئی اور سلام دعا کے بعد وہ جھٹ پٹ بن پوچھے کھانا لے آئی۔

"زہراں! پروہنوں کے لیے بھی بسترے کا انتظام کر دیا تو نے؟" وہ کھانا کھا چکے تو ماسی نے بہو سے دریافت کیا۔

"نئیں ماسی! تجھ سے پوچھنا تھا کہ کدھر لگاؤں۔ ادھر اسی بیٹھک کے پلنگ پر ہی نہ ڈال دوں رضائی۔"

زہراں کا اشارا بیٹھک کے کونے پر لگے رنگین پایوں اور لکڑی کی منقش چھوٹی سی پشت والے بڑے کشادہ سے نواڑی پلنگ کی جانب تھا جس پر بہت خوب صورت سی رنگین کڑھائی والی سفید چار سوتی کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر کے کناروں پر سفید کروشیے سے بہت خوب صورت کام بنا ہوا تھا۔ سرہانے کی سمت تین عدد خوب پھولے ہوئے کڑھائی والے غلافوں والے تکیے پڑے ہوئے تھے۔

"ہاں.... یہ ٹھیک رہے گا۔ دونوں میاں بیوی کے لیے کافی رہے گا۔ یہ بیٹھک گرم بھی کافی ہے۔"

ماسی کے مہمان آخر شہری بابو تھے' ان کے حساب سے بیٹھک ہی ان کے اعلا درجے کی رہائش گاہ تھی۔

کل تین تو کمرے تھے' بیٹھک سمیت۔ ایک میں زہراں' غلام رسول اور ان کے دونوں بچے تھے۔ تو دوسرے میں ماسی اور اس کا خاوند امام دین۔"

"بس تو رضائی ڈال دے وہ شنیل والی ہے ناں' جو پیٹی میں رکھی ہوئی ہے۔ وہ لے آ۔" ماسی نے خاص مہمانوں کے لیے خصوصی اہتمام کی ہدایت کی تھی بہو کو۔ زہراں جھٹ پٹ رضائی لانے کے بعد برتن سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پتر! تسی ہن آرام کرو۔ تھکے ہوئے ہوگے۔ زہراں! یہ اپنا کاکا تو نہیں رو رہا۔" ایک شیر خوار بچے کی آواز کان میں پڑنے پر ماسی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بہو کو بھی متوجہ کرتی گئی۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں جی خیر سے؟" زہراں نے جاتے جاتے یونہی اشتیاق سے زرمل کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ ڈالا۔ جہاں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ ہراساں سی ہو کر انتہائی اضطراری کیفیت میں ہاتھ مسلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتی جیسے خود سے بھی نظر چرا رہی تھی۔

"لے کملی نہ ہو تو۔ ارے ابھی تو نئی نویلی دلہن دکھائی پڑتی ہے یہ۔" ماسی کی تجربہ کار نظروں نے لمحوں میں اس کا سراپا جانچ لیا تھا' تب ہی ہنستے ہوئے بہو سے کہہ رہی تھی۔

"کتنا عرصہ ہوا ہے ویاہ کو؟" اس بار اس سے پوچھا گیا۔

"وہ جی' بات یہ ہے کہ ہم لوگ۔" وہ ٹوٹ کر امڈ آنے والے فطری حجاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے گھبرا کر وضاحت کرنے ہی والی تھی کہ اسی دم تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے عباس بول پڑا۔

"ماسی چار مہینے ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔" اس کے لہجے میں ماسی کے لیے احترام تھا۔

اور زرمل کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹا تھا۔ سٹپٹا کر الجھی گھبرائی متحیر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ماسی سے دوبارہ وضاحت کرنا چاہی مگر اسی دم عباس نے اپنا بھاری پاؤں اس کے پاؤں پر رکھ کر گویا چپ

رہنے کا اشارہ کیا۔

اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ بے یقینی اور سراسیمگی سمیت بھونچکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"چلو اللہ سائیں خیر کرے گا۔ سدا سہاگن رہو۔ اللہ جلد گود ہری کرے۔ اب تم لوگ سو جاؤ۔ میں بھی چلتی ہوں، بہت رات ہو گئی ہے۔ یہ کنڈی لگا لو پتر اندر سے۔ بہت تیز ہوا ہے باہر۔ جیسے بند پھاٹکوں کو بھی اکھاڑ پھینکے گی۔ رب کرے کل تھم جائے مینہ۔ کھڑی فصلوں کے لیے تو نری تباہی ہے تباہی۔"

ماسی اپنی گرم چادر لپیٹتے ہوئے ــــــ کہتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ زرمل تو جیسے پانی پانی ہو گئی تھی۔

"یہ یہ کیا بکواس ہے۔ آپ نے ان کو بتایا کیوں نہیں۔" ماسی کے نکلتے ہی وہ بپھرے ہوئے انداز میں اس سے الجھ پڑی۔ اسے بے طرح شرمندگی ہو رہی تھی۔

"مصلحت اسی میں تھی کہ ان کے قیافے کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ محترمہ! یہ گاؤں ہے یہاں کزنز، گرل فرینڈز یا بوائے فرینڈز کی اصطلاحات سیدھے سیدھے فحاشی کے زمرے میں آتی ہیں۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر موزے اتارنے لگا۔

"مگر میں آپ کی گرل فرینڈ کب ہوں؟" وہ دانت پیس کر مخاطب ہوئی تھی۔ چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"تو کیا ہیں میری؟" ایک لمحے کو رک کر اس نے سر اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

اس کی چمکیلی نظروں میں ڈولتی حد درجہ تندی اور سرد مہری زرمل کو عجیب طرح سے ہولانے لگی۔ وہ گھبرا کر پلکیں جھپک گئی۔ ان نظروں کے انگارے سے اپنے پورے وجود میں دہکتے محسوس ہو رہے تھے۔

"اس قدر طوفانی موسم میں رات گئے ایک جوان لڑکی کو تنہا لے کر اتنے طویل سفر پر نکلنے والے اجنبی کی "پذیرائی" سیدھے سادے سادہ دل لوگ یہ کرتے کہ پنچایت بلائی جاتی اور کھڑے کھڑے اغوا یا گھر سے فرار کا مقدمہ بنا کر قانون پسندی کے اعلا درجے کے اظہار کے طور پر تھانیدار صاحب کو بلوا لیا جاتا کہ لڑکی کے گھر والوں کا پتا لگا کر بہ حفاظت ان کے سپرد کیا جا سکے۔ ان کے ہاں محرم کے بغیر لڑکی کے سفر پر نکلنے کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے مسافر کے ساتھ ایک لڑکی ہمراہ دیکھ کر خود بخود مجھے شادی شدہ سمجھ لیا کیونکہ اس سے آگے کچھ سوچنا ان کے تصور میں ہی نہیں ہے۔ اگر میں ان کی غلط فہمی دور کر دیتا تو رات بسر کرنے کے لیے یہ آخری پناہ گاہ بھی نصیب نہ ہوتی، سو مجھے "مصلحتاً" یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔"

زرمل ہونٹ چباتی چپ ہو رہی۔ ظاہر ہے اور چارہ بھی کیا تھا۔ اوسان تو دونوں کے خطا ہوئے جب ایک اور بھیانک صورت حال کا ادراک ہوا۔

ہوا سے بری طرح بجتے کھلے دروازے کو عباس بند کر کے جب واپس پلٹا تو وہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کرسی کی پشت پر اپنی لرزتی انگلیاں جما دیں۔

"او مائی گاڈ۔" یہ چوئیشن سمجھتے ہی عباس چکرا گیا اور زرمل کی تو یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے بے ساختہ دھڑ دھڑاتے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ آنکھوں میں یہاں وہاں خوف و ہراس کا راج تھا۔

انہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ "مصلحتاً" پیا جانے والا یہ کڑوا گھونٹ اس درجہ خطرناک اور سنگین صورت اختیار کر جائے گا۔ دونوں پریشان سے انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

ساٹھ واٹ کے بلب کی پیلی ملگجی روشنی پلستر لگے در و دیوار سے ٹکرا کر عجیب نامانوس سا امتزاج پیدا کر رہی تھی۔ کمرے میں دو کرسیاں، ایک درمیانے سائز کی مربع شکل کی میز اور دو موڑھے تھے اور دوسرے کونے میں بڑا سا کشادہ پلنگ تھا جسے کھیسوں کی تہوں نے بہت نرم بنا دیا تھا۔ پلنگ پر شنیل کی سرخ بڑے بڑے دلکش پھولوں والی سبز رضائی پائنتی کی جانب سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ پلنگ اتنا وسیع و عریض تھا کہ دو بندے بڑی آسانی سے سو سکتے تھے۔

ماسی اور زہراں نے اپنی طرف سے میاں بیوی کے

لیے شب بسری کا انتظام کرنے میں کوئی کسر نہیں
چھوڑی تھی۔ ضرورت کی ہر شے موجود تھی اور اس
گرجتے برستے سرد برفیلے موسم میں رات کے اس پہر
اس قدر محفوظ، پُرحرارت اور آرام دہ خوابگاہ کا میسر آجانا
اپنی "ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔

مگر یہ لطف تو تب کشید کیا جاتا جب حقیقتاً" یہ
تعلق دل کی گہرائیوں سے اثبات کے مراحل طے کرتے
ہوا پروان چڑھا ہوتا۔ یہاں تو یہ عالم تھا بہت سارے
قریبی رشتوں کی موجودگی کے باوجود دونوں کے دل ایک
ہی کمرے سے ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر تھے۔

ایک اجنبی اور غیر لڑکی کے ساتھ رات ایک کمرے
میں گزارنا یقیناً" کسی بھی خوددار، شریف النفس اور
اعلا انسانی وہ تہذیبی روایات کے علمبردار خاندانی مرد
کے لیے ایک امتحان سے کم نہیں ہوتا اور پھر لڑکی بھی
ایسی جس کی حسن و جوانی قیامت خیز حد تک بہکا دینے
والی ہو۔

اور زرمل کے خدشے تو سوا تر تھے۔ ایسا جارح، بے
رحم، وحشی مرد جو ایک لمحے کو بپھر کر پرانے حساب بے
باق کرنے پر تل گیا تو؟

وہ موڑھا کچھ فاصلے پر کھینچ کر اوطاق میں رکھا کئی
سال پرانا ٹائٹل کٹا پھٹا رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ عباس
کی یہ حرکت اس کے اندر کے اضطراب اور الجھن کی
واضح عکاس تھی۔

زرمل نے گھبراہٹ سے مفلوج ہوتی حسیات
بمشکل تمام چوکس رکھتے ہوئے ایک چور نگاہ موڑھے
پر بیٹھے لمبے چوڑے بھرپور وجود پر ڈالی۔

اس کے انداز میں بڑی شان بے نیازی اور حد درجہ
استغنا جھلکتا تھا۔ وہ ایک دم چھا جانے والی زبردست
پرسنالٹی...... کا مالک تھا۔ دیہات کے تر و تازہ خالص
ماحول میں پلا بڑھا فولادی سراپا ناقابل تسخیر دکھائی دیتا
تھا۔

"بلاشبہ، سر عباس حیدر ذہانت، متانت اور مردانہ
وجاہت کا بے مثال نمونہ ہیں۔"

یونیورسٹی کے طلبہ اور اکثر اساتذہ اس بات کے
قائل تھے۔ مگر زرمل چڑ جاتی۔

"سراسر دھوکا اور فریب کاری ہے۔ چال ہے اس
شخص کی اپنی کھوکھلی شخصیت پر پردے ڈال رکھے ہیں
ورنہ اس کا خاندان تو وہی ہے جو عورتوں کو جوتی کپڑے
کی طرح استعمال کرتا ہے۔"

وہ دل ہی دل میں کھولتی جلتی بھنتی رہتی اور اب
اس طرح اتنی رات کو تنہا ایک بند کمرے میں اس بے
رحمی و سفاکی کے چلتے پھرتے اشتہار کے ہمراہ رات
گزارنے کا تصور ہی اس کی رگ و پے میں سنسنی دوڑا
گیا تھا۔ خوف نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔

"یہ تو پتھر اور فولاد کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ مجھ سی بے
بس، کمزور اور خوف میں ڈوبی لڑکی پر قابو پانے کے لیے
تو اسے چند سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔"

وہ گاہے گاہے خوفزدہ نظریں اس کے رسالے میں
گم وجود پر ڈالتے ہوئے غیر ارادی طور پر ادھر ادھر
دیکھتی بچاؤ کا ذریعہ تلاش کر رہی تھی۔

"اس طرح تو رات گزرنے سے رہی۔" اس کا دل
انجانے خدشات کے پاتال میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔
اعصاب جیسے ٹوٹنے بکھرنے کے صبر آزما مراحل سے
گزر رہے تھے۔

"رات بہت ہو گئی ہے مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میرا
خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔"

دفعتاً" وہ رسالہ طاق میں رکھ کر مڑا اور اس کی
طرف دیکھتے ہوئے کمرے کے وسط میں اس کے قریب
آگیا۔

خوف سے اس کا دل دھڑک کر جیسے حلق میں آ
گیا۔ وہ بے ساختہ غیر محسوس انداز میں پیچھے سرکی تھی۔
وہ اس لمحے متوجہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ
اتاری اور جھٹک کر کرسی کی پشت پر پھیلا دی۔ مما کی
کہی ہوئی باتیں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں
رہا۔" معاً" اس کی گمبھیر آواز کمرے کے سناٹے میں
ابھری۔

زرمل نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سیدھا

اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ زرمل کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ اس کا لہجہ اسے بہت غیر معمولی اور ذو معنی محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا تھا جب وہ اپنی تمام تر وحشتوں کو اس کے وجود میں منتقل کرنے کے لیے قطعی آزاد تھا۔

اس کے خوف سے مفلوج ہوتے اعصاب پر مما کی بتائی ہوئی ماضی کی داستانیں جیسے اوس بن کر گرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

شہزاد اور ثریا بی بی دونوں ہڑپہ شہر کے ایک گمنام سے گاؤں موضع وودا سو کے باسی تھے۔ قسمت اچھی کہ قدرت نے مہر لگا دی، شہزاد پڑھ لکھ گئے اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد لاہور میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر چمڑے کا کاروبار شروع کیا جو دیکھتے ہی دیکھتے ملکوں ملکوں پھیل گیا۔ شادیاں خاندان سے باہر کرنے کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ سو بزنس سیٹ کرتے ہی بڑی سعادت مندی سے اپنے باپ عبدالودود کے طے کردہ رشتے کے مطابق اپنی چچا کی بیٹی ثریا کو بیاہ لائے۔

ثریا کا مزاج گاؤں کی سب لڑکیوں سے قطعی مختلف تھا۔ بے تحاشا حسن، رکھ رکھاؤ، بول چال میں نزاکت، مزاج میں شاہانہ پن اور طنطنہ اپنے حساب سے وہ گاؤں کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ جس نے پوری آٹھ جماعتیں پاس کی ہوئی تھیں سو اس لحاظ سے بھی مرتبہ اونچا ہو گیا۔ ثریا کو ہمیشہ سے اپنے گاؤں کے گھٹے اور یکسانیت لیے ہوئے بیزار کن ماحول سے چڑ رہی تھی۔ شادی کے بعد جو زندگی میں پہلی بار شہر کی اتنی کھلی ڈلی اور چمکتی دمکتی فضاؤں سے مانوس ہوئی تو پھر پلٹ کر دیکھنا سوہان روح محسوس ہونے لگا۔

ماں باپ، رشتے دار گلے شکوے کرتے کہ ثریا تو "پنڈ" کا رستہ ہی بھول گئی ہے مگر ثریا بیگم کو اس گندی مندی گھٹن زدہ فضاؤں سے "الرجی" ہونا شروع ہو گئی تھی۔ شہزاد کو ویسے بھی کون سی فرصت تھی۔ وہ بزنس مائنڈڈ انسان تھے ان کے اپنے دھندے ہی نہیں چھوڑتے تھے۔

ایک دفعہ سسر کے بہت اصرار پر بادل نخواستہ موضع وودا سو گئے۔ اس وقت ان کی اکلوتی بیٹی زرمل شہزاد فقط تین سال کی تھی۔ عبدالودود کو ڈر تھا یہ قدم دوبارہ ادھر نہیں اٹھیں گے سو انہوں نے خاندان کی یکجائی سلامت رکھنے کے لیے اپنے بڑے بیٹے کی سب سے پہلی اولاد یعنی عباس حیدر کا نکاح زرمل سے کر دیا۔ عباس اس وقت غالباً "نو دس" برس کا ہو گا۔

سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع ہوا کہ ثریا بیگم چوں چراں نہ کر سکیں۔ سسر سے بہر حال ڈرتی تھیں۔ دور بیٹھ کر اپنی من مانی تو کرتیں، جب وہ مقابل آتے تھے تو شہر کی "پولشڈ" ثریا پھر سے گاؤں کی ایک سہمی سی ثریا بن جانے پر مجبور ہو جاتی تھی۔

اپنی عزیز از جان بیٹی کا مقدر پھوٹنے کا تماشا ان کے لیے انتہائی روح فرسا تھا۔ اس کے بعد ان کے قدم پنڈ کی رہگزر کے لیے اجنبی ہو گئے پلٹ کر نہ خود گئیں نہ میاں کو جانے دیا۔ یہ شکر تھا کہ میاں سر تاپا ان کے تھے جو کہا جیسا کہا منوا لیا۔ بزنس کے پھیلاؤ کے پیش نظر شہزاد کو انگلینڈ میں رہ کر برانچ کی دیکھ بھال کرنا پڑی تو ثریا بھی جھٹ پٹ تیار ہو گئیں۔ پیسے کی کمی نہ تھی، شہزاد نے لندن میں چھوٹا سا ذاتی گھر خرید لیا اور بیوی اور بیٹی سمیت ملک چھوڑ گئے۔ اور پھر برسوں وہیں قیام رہا۔

اس دوران ثریا بیگم مکمل طور پر خود سے موضع وودا سو کی باسی ہونے کا ٹھپہ صاف کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ انگلش لینگویج کے کورس نے زبان بھی سکھا دی۔ استعمال کی نت نئی چیزیں میسر آئیں تو پہننے اوڑھنے برتنے کے سب طریقے بھی آتے چلے گئے۔ کچے کوٹھوں میں رہنے والی نیم خواندہ ثریا کا نام اب طرحداری، رکھ رکھاؤ، نزاکت و نفاست اور معاشرتی آداب و اطوار کے حوالے سے مثال کے طور پر محفلوں میں گونجا کرتا تھا۔

بے پناہ حسن جسے دو آتشہ کرنے اور سنوارنے نکھارنے میں ان کی خوش لباسی اور خود اعتمادی کے ہتھیار معاونین کے طور پر کام کرتے تھے۔ ایک انتہائی پسماندہ سے گمنام سے گاؤں سے تعلق رکھنے والی شخصیت کو انہوں نے جیسے یادداشت سے بھی کھرچ پھینکا تھا۔

انہوں نے بیٹی کو ہو بہو اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط کے ساتھ پروان چڑھایا۔ اس ڈر سے کہ کہیں خون جوش نہ مار جائے انہوں نے کسی انجانے خدشے کے پیش نظر بچپن سے ہی زرمل کی برین واشنگ کا کام شروع کر دیا۔ وہ اسے "فیڈ" کرتی رہتیں کہ گاؤں میں رہنے والے کس درجہ ناپسندیدہ اور غیر انسانی فطرت کے مالک ہوتے ہیں۔

اپنے سب تنفر آمیز جذبات بیٹی میں بھر دیے۔ وہ اب ان ہی کی زبان بولتی تھی۔ پندرہ برس لندن گزارنے کے بعد وہ واپس لوٹیں تو ایک بار بھی گاؤں جا کر اپنے پیاروں سے ملنے کو جی نہ چاہا۔ لاہور ایئرپورٹ سے سیدھا شہزاد وِلا کا رخ کیا۔ جسے پچھلے سال شہزاد نے بہت ارمانوں سے بیوی اور بیٹی کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تعمیر کرایا تھا۔ بہت بڑا محل نما پرتعیش گھر، اتنا بہت سا پیسہ، لاہور کی ماڈرن سوسائٹی میں لندن پلٹ انتہائی حسین و طرح دار اور معاشرتی ادب آداب کے لوازمات سے سرتاپا مرصع بیگم شہزاد کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ نہایت فخر و غرور سے گردن اکڑائے احساس برتری سے چور خوشی و خوشحالی کی لذتیں کشید کرتیں۔

گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو خون کے رشتوں کی کشش میں خود ہی کھنچے چلے آئے۔ وہ اپنی پرانی والی ثریا سے ملنے آئے تھے مگر یہاں تو کوئی اور ہی شہری میڈم موجود تھی۔ ثریا کے بلا کے بے مہر اور خشک رویے شہزاد کی حد درجہ ـــــ مصروفیات کے باعث انتہائی قلیل عرصے کے لیے نظر آنے والی شکل اور "السلام علیکم کیا حال چال" کے بعد آنا" فانا" لمحوں میں ضروری کلام سے یہ جا وہ جا والی کیفیت اور زرمل کے ہاں کے سکھائے ہوئے نخوت زدہ روکھے پھیکے انداز ان سب نے اپنوں سے ملنے کی حسرت و چاہت پر اوس ڈال دی۔ وہ جتنے خلوص اور محبت سے ان سے ملنے اور گاؤں آنے کی دعوت دینے لگے تھے، اتنی ہی بددلی سے واپس پلٹ گئے۔

کبریٰ کو بہو کا بہت چاؤ تھا۔ بڑے اہتمام سے ہر عید، شبرات اور تہوار پر مقدور بھر تحائف بھجوایا کرتیں جن کا ثریا بیگم، خوب ہی مذاق اڑاتیں۔

"بھابی! کیا ضرورت تھی اتنا تردد کرنے کی۔ دیکھیں ناں، یہ چار پانچ سو کا جو آپ نے نکما سا کپڑا لے کر اس پر ایسی بے کار "پینڈو اسٹائل" کڑھائی اور گوٹہ کناری لگائی ہے اس طرح کا کپڑا تو ہماری ملازمہ کے "اسٹینڈرڈ" پر بھی پورا نہیں اترے گا۔ پھر زری تو محض شب خوابی کا لباس ڈیڑھ دو ہزار سے کم کا نہیں پہنتی۔"

کپڑا ذرا سا چٹکی میں لے کر انتہائی تمسخرانہ تیوروں سے کبریٰ کی جانب دیکھتی ثریا بیگم کے ناگوار تاثرات کبریٰ کو پانی پانی کر گئے تھے۔

"بہن! مجھے بیٹی کی پسند ناپسند کا اتنا اندازہ نہیں تھا۔ بس ارمان تھا کہ زری بیٹی عید پر تائی کا دیا ہوا سوٹ پہنے۔ چلو آج شام کو اسے بازار لے چلتی ہوں عباس کے ساتھ۔ جیسا اس کا دل چاہے گا پسند کر لے گی۔" وہ شرمندہ سی توجیہہ پیش کر رہی تھیں۔

"آپ زحمت نہ کریں۔ عید کے کپڑے تو وہ پچھلے ہفتے بنوا چکی ہے اپنی مرضی سے۔ باقی شاپنگ کے لیے پیرس جائے گی دو تین روز بعد۔ اپنے پاپا کے ساتھ پروگرام ہے اس کا۔" ان کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

"امی! چلیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔" عباس جو ماتھے پر شکنیں لیے بڑی دیر سے چپ بیٹھا سن رہا تھا، ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ اس دن پہلی اور شاید آخری بار "شہزاد ولا" آیا تھا۔ پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔ البتہ کبریٰ نے ہمت نہیں ہاری۔ ثریا بیگم کے طنز و تمسخر کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر موقع پر بہو کے لیے کچھ نہ کچھ لے کے آن موجود ہوتیں۔ زرمل کو جب شروع شروع

میں اپنے نکاح کی خبر ہوئی تھی تو جیسے صدمے سے پاگل ہی ہو گئی تھی۔ ایسے میں ثریا بیگم نے اسے اپنی آغوش میں بھرتے ہوئے تسلی کرائی۔

"ارے میری جان! تم قطعی بے فکر رہو۔ بھلا میں اپنی جان سے پیاری بیٹی کو اس جہنم میں جلتا دیکھ سکتی ہوں۔ میں نے پہلے ہی انتظام کر رکھا ہے۔ تمہارے پاپا کو ذہنی طور پر اس فیصلے کے لیے تیار کر لیا ہے کہ تمہاری شادی گاؤں میں ہرگز نہیں کریں۔ ایک تو ماحول کا فرق ہے دوسرے ہم اپنی بیٹی کو ساری عمر سوتن کا دکھ جھیلتے نہیں دیکھ سکتے۔ وہاں کے مرد پہلی دوسری شادی تو شغلاً" کرتے ہیں اور تین چار سے پہلے تو "فل اسٹاپ" لگانے کا کچھ تصور ہی نہیں ہے۔ ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے۔ میں جانتی ہوں کیوں کبریٰ کے پیر میں چکر پڑے ہوئے ہیں۔ تمہارے حسن، تعلیم اور اسٹیٹس کے بل پر وہ بیٹے کو یہاں لاہور شہر میں مستقل سیٹ کرانے کے خواب دیکھتی ہے۔ شاید اس کو دوسرا "شہزاد" بنانے کے ارمان دل میں پالے ہوئے ہیں۔ سنا ہے بیٹے نے یونیورسٹی میں اسکالرشپ حاصل کیا ہے اور اب اعلا تعلیم کے لیے حکومت کی طرف سے ہارورڈ یونیورسٹی بھیجا جا رہا ہے۔ ہونہہ کچھ بھی کر لے رہے گا تو اسی خاندان کا سپوت جنہیں حرم بنانے کا جنون کی حد تک شوق رہا ہے۔"

ثریا بیگم کے انداز میں تحقیر و تنفر تھا۔

"تمہارے پاپا نے میرے کہنے پر بابا جان سے بات کی ہے کہ وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔ ہم جلد ہی قانونی طور پر کاغذات بھی سائن کروالیں گے۔ تم یوں سمجھو جیسے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نام نہاد نکاح کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور میں نے تو تمہارے لیے جانے کیا کیا سوچ رکھا ہے۔" ثریا ساڑھی کی فال درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور آہستہ سے اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کچھ سوچ کر دوبارہ مخاطب ہوئیں۔

"تمہارے لیے بہت سے رشتے آ رہے ہیں۔ ہمارے سارے جاننے والے اپنے بیٹے کے لیے تم میں انٹرسٹڈ ہیں۔ خصوصاً" وہ مسز خان تو اپنے جمشید کے لیے بہت عرصے سے کہہ رہی ہیں۔ ابھی کوئی جلدی نہیں، ابھی تو تم پڑھ رہی ہو۔ میں کسی کو بھی تمہارے بچپن کے اس نکاح کے بارے میں نہیں بتایا۔ تم بھی کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مجھے تو سوچ کر ہی شرم آتی ہے کہ اگر ہمارے ملنے والوں کو خبر ہو جائے مسٹر اور مسز شہزاد نے اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ گاؤں کے اتنے اجڈ گنوار جنگلی خاندان میں طے کر رکھا ہے تو کس طرح نہ تمسخر اڑے گا ہمارا۔ تمہارے پاپا کی ساری عزت خاک میں مل جائے گی اور میں تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔" وہ بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئیں۔ "میں تو ان کی آمد کو بھی بمشکل تمام برداشت کرتی ہوں۔ بس چپ چاپ یہ نام نہاد کاغذی رشتہ ختم ہو جائے تو صاف کہہ ڈالوں گی کہ دوبارہ زحمت نہ کریں۔"

اور زرمل حرف بہ حرف ماں سے اتفاق کرتے ہوئے پوری طرح مطمئن ہو گئی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ اس نے یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لیا تو پریولیس کے حصے میں سر عباس حیدر آ گئے۔ تین سال امریکہ میں اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پاکستان آیا تو یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی آفر مل گئی۔ یہاں وہ جاب کے ساتھ ساتھ اپنی پی ایچ ڈی بھی کمپلیٹ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی انتظامیہ میں اسے بہت اہم عہدہ دیا گیا تھا۔ اس کے لیکچر دینے کے انداز سے اسٹوڈنٹس بڑے امپریس ہوتے تھے۔ اس کا نام ذمہ دار ذہین اور سلجھے ہوئے اساتذہ میں شمار کیا جاتا تھا۔

یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے یہ اس کا تیسرا سال تھا۔ اس دوران وہ لاہور کے ایک پرسکون سے علاقے میں اپنا ایک چھوٹا سا خوب صورت ذاتی گھر بنا چکا تھا۔ اس سے چھوٹا ایاز اور سرمد اور بہن صبیحہ یہیں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اماں اور ابا جی کو بہت بلوایا۔ مگر ان کا یہاں دل نہیں لگتا تھا۔ ہاں آتے جاتے ضرور تھے۔

زرمل نے جب ایڈمیشن لیا اور باقاعدہ کلاسز جوائن کیں تو "سر عباس حیدر" کی یونیورسٹی میں اس قدر پذیرائی پر جیسے بھونچکا سی رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے اجڈ اور معاشرتی ادب آداب سے بے بہرہ پسماندہ سے خاندان کا بندہ اس درجہ پولائٹ نیس "ڈیسنسی اور گریس کی علامت بن جائے گا۔

اس کا خیال تھا اپنی خاندانی نفس پرستی کے مظاہرے کے طور پر ضرور اس کے پیچھے آئے گا۔ اس کی توجہ کی بھیک مانگے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ وہ تو اس کے وجود سے یکسر بے نیاز تھا۔ "اسپیشل ٹریٹ منٹ" تو ایک طرف اس کے برعکس اس کا رویہ زرمل کے ساتھ دوسرے طلباء کے مقابلے میں خاصا جارحانہ اور سرد ہوتا تھا۔

وہ اس کی اس درجہ بے نیازی بلکہ صاف طور پر نظر انداز کرنے والی پالیسی پر دہک کر آتش فشاں بن گئی۔ پہلے ہی دل میں بہت سارا میل اور بدگمانیاں جمع تھیں اب ان میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور اس دن تو جیسے وہ تندور ہی بن گئی تھی۔

"وہ بیٹھے ہیں اندر؟" عباس حیدر کے روم سے نکلتے اپنے کلاس فیلو اسفندیار سے بگڑے بگڑے انداز میں پوچھا۔

"وہ' وہ کون؟" بے چارہ اسفندیار ہکا بکا اس کی شکن آلود پیشانی دیکھ رہا تھا۔

"وہ... وہی۔" وہ جزبز سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی "سر عباس۔" اس کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھل گئی تھی اس کا نام لیتے ہوئے۔

پھر اسفندیار کے اثبات میں جواب دینے پر وہ جیسے بپھرتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ ٹیبل پر جھکا انہماک سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

"اس پر سائن فرما دیجئے۔" بہت چبا چبا کر بولتے ہوئے اس نے کچھ پیپرز اس کے سامنے پٹخے تھے۔

مما نے جتایا تھا کہ ثقل بابا نے مما کے کہنے پر عباس کو طلاق کے کاغذات بنوا کر بھجوائے تھے دستخط کروانے کے لیے لیکن کل وہ کاغذات جوں کے توں واپس مل گئے تھے رجسٹری کی شکل میں۔

عباس نے نہایت سکون سے سر اٹھایا۔ ایک تلخ ناگوار نگاہ اس پر ڈالی اور پھر کچھ کہے بنا ہاتھ سے پیپرز ایک سائیڈ پہ کر کے دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ یوں جیسے کمرے میں ایک جیتا جاگتا حسین و نوخیز وجود نہ ہو پتھر کا مجسمہ دھرا ہو۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس کے تو سر پہ لگی اور تلووں پہ بجھی۔ "آپ کو دستخط کرنا ہوں گے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"عجیب تماشا بنایا ہوا ہے۔ میں آپ کی نفس پرستی کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی 'میٹر' ہی چاہیے تو کوئی اپنے معیار کی ڈھونڈیں اور..."

"اوہ شٹ اپ۔" یک بیک اس کے لہجے میں آتش فشاں دہک اٹھا تھا۔ وہ بڑی برداشت رکھنے والا بندہ تھا اور بہت کم آؤٹ آف کنٹرول ہوتا تھا۔ مگر زرمل کے اس درجہ نخوت آمیز حکمانہ انداز نے اس کے اندر آگ سی بھڑکا دی۔ وہ جس کاٹ دار اور توہین آمیز انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی اس نے اس کے اندر وحشت سی بھر دی۔ مردانہ مردانگی پر ضرب پڑتے ہی زخمی شیر بن جاتا ہے۔

وہ لمحہ بھر میں ڈگ بھر کر اس کے سامنے آیا اور غصے سے سرخ پڑتے چہرے سمیت آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچ ڈالا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس درجہ جسارت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کی نظروں میں تو جیسے زمین و آسمان گھوم گئے۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر' تمہاری صورت اور تمہارے اسٹیٹس پر۔" اس کے دونوں ہاتھ آہنی گرم سلاخوں کی طرح اس کے دونوں کندھوں پر جم گئے اس کا الجھتا ہوا پر تپش تنفس زرمل کو بھاپ کی طرح چہرے پر لگ رہا تھا۔ اس کا پرکشش مردانہ چہرہ سرخ ہو کر بالکل قندھاری انار بن گیا تھا۔ وہ اپنی ساری چوکڑی بھول کر پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے اسے دیکھتی

رہ گئی۔

احساس ذلت کے سبب اس پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ زرمل کا دل خوف سے بند ہونے لگا۔ مرو کا ایسا جارحانہ اور وحشی روپ کب دیکھا تھا۔

"میرے اختیار میں ہوتا ناں تو ایک دہائی قبل اپنا نام تمہارے نام کے آگے سے مٹا چکا ہوتا۔ دادا جان کی التجائیں ہاتھ باندھ دیتی ہیں ورنہ۔۔۔" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔

"تم جیسی لڑکیاں تو میری ٹھوکروں میں ہوتی ہیں۔"

ایک ثانیے کو رک کر اس نے تحقیر آمیز لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔ "جانتا ہوں اچھی طرح تمہارے سطحی مزاج کو میں۔ آخر ماں کی تربیت یافتہ ہو۔" اس کے لہجے کی کاٹ اور چبھن نے زرمل کو کھولا کر رکھ دیا۔

"آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر یا میری ماں پر الزام تراشی کرنے والے۔" وہ بے ساختہ ابل پڑی۔ "اور چھوڑیے میرے بازو' شرم آنی چاہیے آپ کو۔"

اور دوسرے ہی لمحے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کا گال سرخ کر گیا تھا۔

"اگر میں ایسا ہی نفس پرست ہوتا تو آج تم میرے تین چار بچوں کو پال رہی ہوتیں اور میں چاہوں تو تمہیں تمہاری اس درجہ زبان درازی اور بدتمیزی کا بڑی آسانی سے مزہ چکھا سکتا ہوں۔ تمہیں ایک دو دن کے لیے کسی ہوٹل میں لے جا کر اپنی گھڑیاں رنگین کر لینے کے بعد طلاق دے دوں تو بتاؤ کیا بگاڑ لو گے تم لوگ میرا؟ شرعی و قانونی حق رکھتا ہوں تم پر' جب جی چاہے استعمال کر سکتا ہوں۔ میرا تو کچھ نہیں جائے گا' ہاں تمہارے نام نہاد کنوارپن کا بھید کھل جائے گا اور تمہیں سر آنکھوں پہ بٹھانے والے تمہارے حلقہ احباب کے لوگ' جن سے تم لوگوں نے یہ تعلق خفیہ رکھا ہوا ہے ان پر جب یہ کھلے گا کہ تم نے اپنے باپ کی عزت کا جنازہ نکال دیا ہے تو تم پر ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ تم لوگ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

اس کے ہاتھوں کا آہنی وحشیانہ دباؤ ایک ایک کر کے اس کی ساری بدافعانہ حسیات کو سلاتا چلا گیا۔

"چھوڑ دیجیے مجھے پلیز۔" اس کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔

اس کی سہمی سہمی نظروں میں اترتا پانی کام کر گیا تھا۔ لب کاٹتے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بالآخر اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنی ناہموار سانسیں متوازن کرنے لگا۔

"آئندہ میرے ساتھ اس طرح کی گفتگو کی نتیجے کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔"

وہ اپنے اندر کے اشتعال اور وحشت سے بھرے مرو کو نئے سرے سے گہری نیند سلانے کے لیے رخ موڑ کر دونوں ہاتھوں کو مضطربانہ انداز سے آپس میں رگڑتے ہوئے اپنے اعصاب پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں بدستور دادا جان کو اس سلسلے میں راضی کرنے میں لگا ہوا ہوں' جس دن محسوس کر لیا کہ میرا فیصلہ ان کے دل اور اعصاب پر بجلی بن کر نہیں گرے گا اور وہ اس امر کو قبول کرنے پر ذہنی طور پر آمادہ ہو جائیں گے اسی دن آپ کے حسب منشاء کاغذات آپ کو مل جائیں گے' مجھے آپ کو اپنی ذات سے منسلک رکھنے کی قطعی کوئی چاہ نہیں۔" اس کے سرد لب و لہجے میں تحکم در آیا تھا۔ "جا سکتی ہیں اب آپ۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر ایک دم پلٹا اور کرسی پر بیٹھ کر کتاب اپنے چہرے کے آگے رکھ لی۔

زرمل تھکے تھکے قدموں سے بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسے اس قدر سبکی محسوس ہو رہی تھی کہ زمین میں دفن ہو جانے کو جی چاہ رہا تھا۔

سو اس نے بدلہ لینے کی ٹھان لی اور اس کی خواہش بالآخر پوری ہو گئی۔

۞ ۞ ۞

یونیورسٹی کے ڈرامیٹک کلب کے سیکرٹری نے یونیورسٹی کے ایک فنکشن کے لیے تیار کیے گئے ڈرامے میں زرمل کو ہیروئن کے رول کی آفر کی۔ جو

اس نے قبول کرلی۔ اتفاق سے فنکشن میں ٹی وی کا ایک مشہور و مستند پروڈیوسر رضا چوہدری بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے زرمل کی کمال درجے کی اداکاری سے متاثر ہو کر اسے اپنے ڈرامے میں مرکزی کردار کی آفر کی۔ اتفاق سے عباس بھی وہیں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے ناگوار تاثرات نے عجب ضد سی دلادی۔ ویسے تو شاید نہ کرتی مگر اسے جلانے ستانے کا موقع ہاتھ لگ گیا تھا سو جھٹ رضامندی دے ڈالی۔

"مس زرمل شہزاد! آپ کو سر عباس حیدر بلا رہے ہیں۔" اس کے ایک کلاس فیلو نے بتایا تھا۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ بدمزا سی ہو کر بولی۔

"جی!" اس کے لہجے کے تحیر پر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی رو میں بے دھڑک کیا کہہ گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہی تھی کہاں ہیں وہ؟" اس نے تیزی سے خود پر قابو پا کر بات بنائی۔ طوعاً" و کرہاً" اسے اس طرف جانا پڑا جہاں اس کا کلاس فیلو نشاندہی کر گیا تھا۔

"ضرور اس جرنل کی بات کرنا ہوگی جسے اس کی اتنی تاکید کے باوجود مقررہ تاریخ پر جمع نہیں کرایا تھا۔" اسے جیسے اس کی ہر بات میں ضد باندھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"رضا چوہدری کو انکار بھجوا دیں۔ آپ ڈرامے میں کام نہیں کریں گی۔"

وہ بغیر کسی سلام دعا کے ناخوشگوار تاثرات سے مزین چہرہ لیے چپ چاپ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ چھوٹتے ہی خشک و سپاٹ تحکم بھرے انداز میں گویا ہوا۔

"یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔" وہ اس کے انداز پر تپ کر اکھڑپن سے بولی۔

"یہ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔" وہ ایک دم جلال میں آگیا۔ "دادا جان کو خبر ہوئی تو صدمے سے ہوش کھو بیٹھیں گے اور میں ان کو تکلیف پہنچانے والی ہر شے کو راستے سے ہٹا دیا کرتا ہوں۔"

"سینکڑوں کوس دور بیٹھے ہیں وہ۔" وہ جزبز ہو کر الجھنے لگی۔ کہنے کا مطلب تھا ان تک یہ خبر کیونکر پہنچے گی۔

"موضع دودا سو خلائی سیارے میں واقع نہیں ہے محترمہ!" وہ طنز سے گویا ہوا۔ "وہاں بجلی بھی ہے اور گھروں میں ٹی وی بھی آچکے ہیں۔ آپ پہلی فرصت میں چوہدری صاحب کو جواب دے دیں۔" اس کا انداز حتمی تھا۔

"اور جو نہ دوں تو؟" اس نے بڑی جسارت سے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرکشی سے پوچھا۔

عباس نے ایک لمحے کو بغور اس کا چہرہ نظروں سے جانچا۔ سفید گلابی مائل حسین و دلفریب نقوش سے سجا ساحرانہ مکھڑا، دلکش متناسب سراپا۔ بلاشبہ نہد شکن تھا۔

"تو بہرحال ایک پتّا میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کارڈ کو کسی وقت بھی استعمال کر سکتا ہوں۔"

اس کے بے رحم لہجے میں چھپی تنبیہہ اور دھمکی لمحوں میں زرمل کو زیر کر گئی۔ ان سیاہ چمکیلی آنکھوں میں ایسی برودت تھی کہ وہ بے ساختہ خائف سی ہو کر نگاہ چرا گئی۔

وہ بے بس ضرور ہو گئی تھی مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کا دل اس کے خلاف نفرت اور منتقمانہ جذبوں سے لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس کاغذی بندھن سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ اس کی درشت مزاجی اور بے مہری اسے لحہ لحہ سلگاتی تھی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ گاؤں سے اس دن ٹیلی گرام موصول ہوا جب شہزاد صاحب کو لندن روانہ ہوئے محض ایک گھنٹے ہوئے تھے اور ثریا بیگم کے پیرس کے لیے ٹکٹ آئے رکھے تھے۔ شام کو ان کی فلائٹ تھی ان کا مسز آفریدی کے ہمراہ ایک ہفتہ وہاں رہ کر شاپنگ کرنے کا پروگرام طے تھا۔ عبدالودود صاحب کی طبیعت سخت خراب تھی۔ ان کی حالت نازک تھی اور انہوں نے جائیداد وغیرہ کے بٹوارے کے سلسلے میں

کاغذات سونپنے کے لیے ان لوگوں کو بلوایا تھا۔

محض عبدالودود صاحب کی بیماری ہوتی تو شاید ثریا بیگم پروا نہ کرتیں مگر اس کے ساتھ ساتھ زمین جائیداد کے کاغذات کا بھی معاملہ تھا۔ سو وہ بادل نخواستہ زرلی کو بھیجنے پر آمادہ ہو گئیں۔ شہزاد صاحب کا اتنی جلدی لندن سے واپس آنا مشکل تھا اور وہ بھی پیرس کی فلائٹ مس نہیں کر سکتی تھیں۔ ایسے میں زرلی ہی بچتی تھی۔ مگر اسے بھیجنے کا مسئلہ تھا۔ اس نے تو کبھی اپنے ہوش میں گاؤں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی عمر کا زیادہ تر حصہ باہر گزرا تھا۔

اتفاق سے کبریٰ خانم کا فون آگیا۔ وہ آج ہی صبیحہ کو لے کر شہر آئی تھیں۔ صبیحہ کا پرچہ تھا' وہ دو تین ہفتے قبل گاؤں چلی گئی تھی۔ کبریٰ بمسری مزاج پرسی کے بعد بیٹی کو شہر چھوڑنے آئی تھیں۔ پھر عباس کو بھی اطلاع دینا تھی۔

"ثریا بہن! عباس بھی تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی سے آکر جانے کے لیے نکل رہا ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو زری بیٹی کو اس کے ساتھ روانہ کر دیں۔"

عام حالات میں ثریا بیگم مر کر بھی گوارا نہ کرتیں مگر اب مجبوری تھی۔ سو راضی ہو گئیں۔ زرلی کو پتا چلا تو خاصا واویلا مچایا۔ خوب بسوری کہ اکیلے نہیں جا سکتی بور ہو جاؤں گی' یہ 'وہ۔

"میری جان! ایک آدھ دن کی تو بات ہے' بس حاضری ہو جائے گی' ورنہ تمہیں پتا ہے ساری عمر طعنہ ملتا رہے گا کہ قرب المرگ سسر کو اطلاع پر بھی پوچھنے نہیں آئی۔ تمہیں کیا پتا یہ خاندان والے تو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں پھر تمہارے پاپا کے حصے کی خاصی جائیداد اور زمینیں بھی ہیں۔ ان کے کاغذات کی وصولی ضروری ہے۔ کیا خبر کل کلاں تمہارے تایا اور چاچا وغیرہ قابض ہو بیٹھیں۔ ہم تو کبھی بھولے سے بھی ادھر نہیں گئے۔ سو وہ آرام سے سب سنبھال لیں گے۔"

یوں اسے جانا پڑا۔ عباس قطعاً "راضی نہیں تھا مگر دادا جان کی حالت کے پیش نظر اور کبریٰ کے سمجھانے بجھانے پر بمشکل اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوا تھا۔ اوپر سے اس کے نخرے اور طنطنے دیکھ کر اس کی جھنجلاہٹ اور کوفت سوا تر ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی۔ اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں آنکھیں پھاڑ کے۔" وہ جھنجلا گیا۔

اس نے جیسے بہت سہم کر ہراساں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کہہ رہا ہوں یہ "مراقبہ" کرنے کا وقت نہیں ہے۔" وہ اس کو سوچ بچار میں ڈوبا دیکھ کر برہم ہوا تھا۔ "جائیں جا کر سو جائیں بستر پہ۔" اس نے اپنی جھلاہٹ ضبط کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"اور آ' آپ...." اس کا دل اس سے اس بری طرح دھڑک رہا تھا کہ جسم کے روئیں روئیں میں جیسے یہ "دھک دھک" دوڑ گئی تھی۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں لہجے میں ایک نامعلوم سی پست سی کیفیت در آئی تھی

"میں بھی کچھ کرتا ہوں۔ فی الحال آپ تو نپٹیں ناں!"

پھر وہ آگے بڑھا۔ درمیانی میز ایک طرف کھسکائی۔ پلنگ کے اوپر پڑی رنگین چادر کھسکائی۔ دو تین کھیس تہ در تہ بچھائے ہوئے تھے۔ اس نے دو کھیس الگ کر کے پلنگ پر دوبارہ سے چادر ڈال کر رضائی درست کی' پھر میز ہٹا کر خالی ہو جانے والی جگہ پر ایک کھیس بچھایا۔ تکیہ ایک طرف جما کر کچھ سوچ کر کرسی کی پشت پر پڑی جیکٹ دوبارہ اٹھا کر پہن لی۔ دوسرا کھیس ٹانگوں پر پھیلا کر اچھی طرح جسم اطراف سے لپیٹ کر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے "زمینی" بستر پر استراحت فرما رہا تھا۔

وہ دم بخود سی لب بستہ کھڑی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

"کھڑے کھڑے رات نہیں گزرے گی۔ ابھی لمبا سفر باقی ہے۔ موڈ نہیں ہے تو بھی سو جائیں۔ روشنی تنگ کر رہی ہے تو بلب بجھا دیں۔ بے کار خدشات کو دل میں جگہ نہ دیں۔ نفس پہ سواری کرنا مشکل سہی مگر

ایسا ناممکن بھی نہیں اور میں نے اس کو کبھی بھی منہ
زور نہیں ہونے دیا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اس
وقت "حالت جنگ" میں نہیں ہوں۔ منزل تک
بحفاظت پہنچنے تک آپ کی جان و آبرو میری ذمہ داری
ہے۔ ناخوشگوار ہی سہی مگر بہرحال مجھ پر عائد کر دی گئی
ہے۔ اور پھر میں بد عہد اور خائن نہیں ہوں۔"

وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر کروٹ بدل کر کھیس منہ
پر تان کے سر کے نیچے دباتے ہوئے جیسے قلعہ بند ہو گیا
تھا۔

وہ صم بکم سے انداز میں تنے ہوئے سفید کھیس پر
خالی خالی نظریں جمائے اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش
کر رہی تھی۔

پھر آہستہ قدموں سے چلتی وہ قدرے ہچکچاہٹ کی
بعد پلنگ تک آئی' جوتے اتار کر بہت تذبذب کے بعد
ٹانگیں اوپر کر کے پلنگ کی چھوٹی سی پشت سے ٹیک لگا
کے شنیل کی بھاری رضائی اپنی طرف سرکا کر اوڑھتے
ہوئے دزدیدہ نظروں سے کمرے کے ایک کونے میں
زمین پہ پڑے سفید کھیس میں چھپے لمبے چوڑے وجود کو
بے یقینی کے عالم میں دیکھا۔

وہ جیسے یقین و بے یقینی کے گرداب میں پھنس کر رہ
گئی تھی۔ کتنی ہی دیر تو اپنی حفاظت کے خیال سے
شعوری طور پر خود کو بیدار رکھنے کی سعی کرتی رہی مگر پھر
دبیز نواڑی پلنگ اور گرم بھاری مخملیں رضائی نے دن
بھر کے تھکے وجود کو اپنی پرحدت پناہیں بخش کر نیند کی
آغوش میں دھکیل دیا۔

اس کی نیند بہت ڈسٹرب تھی۔ کتنی ہی بار رات
میں ٹوٹی اور ہر بار بے اختیار اس کی نگاہ پہلے اپنے بائیں
جانب خالی پہلو پر اور پھر اس سفید کھیس کے تنے
ہوئے خیمے پر جا ٹکتی تھی۔ جہاں کسی قسم کی جنبش
نہیں ہوئی تھی۔

بالآخر صبح فجر کی اذانوں کے بعد وہ دوبارہ بیدار ہو
گئی۔ اس وقت وہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں تھی۔
دور کہیں سے دودھ بلونے' مویشیوں کے ڈکرانے اور
مرغے مرغیوں کے شور مچانے کی آوازیں کان میں پڑ
رہی تھیں۔ تھکے ہوئے بوجھل جسم کا ڈھیلا پن دور
کرنے کے لیے وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر بستر سے
اٹھ بیٹھی۔

اس نے پشت پر کھلنے والی کھڑکی کا پٹ ذرا سا وا کر
کے باہر جھانکا۔ رات کا طوفان تھم چکا تھا۔ آسمان پُر
سکون تھا۔ دور افق سے سحر نمودار ہونے کے آثار
ہویدا تھے۔ ہوا میں البتہ موسم سرما کی بھرپور خنکی تھی۔

اس نے آہستہ سے کھڑکی دوبارہ بند کر دی اور
کندھوں پر پریشان سلکی گھنے آبشار ایسے بالوں کو ایک
ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے بستر سے نیچے اتر آئی۔

معاً اس کی نگاہ سوئے ہوئے عباس پر جا پڑی۔
رات کے کسی پہر کروٹ بدلنے سے منہ پر لپٹا ہوا
کھیس تھوڑا سرک گیا تھا۔ اس کا خوابیدہ چہرہ صاف
نظر آ رہا تھا۔ وہاں حد درجہ متانت' ٹھہراؤ اور بے نیازی
کے تاثرات رقم تھے' یوں جیسے سارا زمانہ اس کی
ٹھوکروں میں ہو۔ خود میں مگن رہنے والا مست سا بے
پروا خود اعتماد انداز۔

اس قدر برفیلے سرد موسم میں اتنی ٹھنڈی زمین پر
اس نے محض ایک ہلکے سے کھیس میں لپٹ کر رات
گزاری تھی۔ اس کے آرام کے لیے خود تکلیف
برداشت کی تھی ذرمل کے احساسات عجیب تر ہو رہے
تھے' اس قدر بھیانک اور ہولناک طوفانی رات کے
اس درجہ سکون سے گزر جانے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا کوئی اس درجہ ضبط نفس اور ثابت قدمی کا
مظاہرہ کر سکتا ہے؟"

مما کے پرزور انداز میں کیے جانے انکشافات میں
سے کتنے ہی باطل ثابت ہو گئے تھے۔ ہوس گیری اور
نفس پرستی کا معمولی سا مظاہرہ تو کجا اس نے تو ایسی ویسی
نظر سے دیکھنا بھی جیسے خود پر حرام سمجھ لیا تھا۔

اس کا دل عجیب طرح کی پرسوز کیفیات سے
مغلوب ہوا جا رہا تھا۔ بے اختیار ہی وہ اس کے قریب
چلی آئی۔

"سنیے!" جانے کن جذبوں میں گھر کر وہ آہستہ سے
اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے ہلاتے ہوئے

اسے جگانے لگی۔ کچھ ساعت بعد اس نے بالآخر آنکھیں کھول دیں۔

نظریں سیدھی خود پر جھکی زرمل پر پڑی تھیں جو اس کے بیدار ہونے کی منتظر تھی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ عباس کی نیند کے خمار سے سرخ ہوتی سیاہ کشادہ چمکدار آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ اس کی پلکیں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔ ان سرخ ڈوروں والی مخمور آنکھوں کی تپش زرمل کو عجب طرح سے آنچ دینے لگی تھی۔

"میں میں یہ کہہ رہی تھی۔" وہ بلاوجہ ہکلائی۔ "کہ آپ ادھر پلنگ پر سو جائیں۔ میں نیند پوری کر چکی ہوں۔" وہ نگاہ کترا کر کھڑی ہو گئی۔

"اب تو صبح ہونے والی ہے۔" وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھا۔

"پھر بھی سورج نکلنے میں ابھی خاصا وقت ہے۔"

اس کے لہجے کی حلاوت اور اپنائیت آمیز فکر مندی عباس کے لیے خاصی حیران کن تھی۔ مگر اس نے زیادہ تجسس نہیں کیا۔ سردی کے مارے ساری رات کی اکڑی برف ہوتی ٹانگیں سمیٹتے ہوئے اٹھ کر بستر پر چلا آیا اور صبح دن چڑھے تک سوتا رہا۔

غلام رسول اس دوران اپنے کسی جاننے والے موٹر مکینک کو بلا لایا تھا۔ جس نے گاڑی چیک کر کے اسے فٹ فاٹ کرنے کے بعد اوکے کر دیا۔ ماسی کے بھرپور اصرار کے باوجود پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے عباس عجلت میں اس کو ساتھ لے کر نکل پڑا تھا۔ ابھی خاصا لمبا راستہ پڑا تھا۔ شکر تھا ہر شے معمول پر تھی۔ موسم کی جنوں خیزی بھی ختم ہو گئی تھی اور گاڑی بھی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔

دوپہر سے کچھ پہلے وہ لوگ ہڑپہ پہنچے اور اس سے آگے تقریباً چار پانچ میل شمال مغرب کی جانب موضع دوداسھو کا گاؤں تھا۔ اس کے بالکل مغرب میں تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے راوی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گزرتا تھا۔ اور اس کے بالکل نزدیک "سک راوا" بہہ رہا تھا۔

گاؤں کے مشرق میں ایک بہت بڑا جنگل شیشم، سفیدے، کیکر اور سنبل کے درختوں پڑا تھا۔ جنگل سے فاختہ، بٹیر اور تیتروں کے چہچہانے کی آوازیں دور سے کان میں پڑنے لگتی تھیں۔

جنگل سے کچھ فاصلے پر مچھلی فارم تھا۔ ایک فارم بھی موجود تھا۔ دونوں فارم دادا جان کی ملکیت تھے۔ گندم، جو، مکئی اور گنے کی تاحد نظر پھیلی سرسبز فصلیں نگاہ کو تراوٹ بخشتی تھیں۔

گاڑی نیم پختہ سڑک پر چلتی ایک سرخ اینٹوں سے بنے وسیع و عریض مکان کے آگے جا رکی جہاں سوزوکی کی آمد سے ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کو بے قرار تھے۔ اور یہ چیز اس کے لیے خاصی حیران کن تھی۔

یہیں پلا بڑھا تھا۔ مگر جس طرح وہ سب لوگ تفریق اس کو باری باری گلے لگا کر محبت و اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور بڑے اشتیاق اور چاہت سے شہزاد اور ثریا کا حال چال دریافت کر رہے تھے۔ وہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی قائل سی ہونے لگی۔

اسے بوڑھے لوگوں کی قربت سے عجیب بیزاری اور کوفت ہوتی تھی۔ انہیں کمپنی دینا اسے ہمیشہ جھلاہٹ میں مبتلا کر دیا کرتا تھا مگر جب عبدالودود کے شفیق سینے سے لگی تو جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ ان کے قرب میں عجب طرح کے تحفظ اور پناہ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بلا تکلف ان کے پلنگ کے سرہانے ان کے پاس بیٹھ گئی وہ اس سے چھوٹی موٹی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

"زری کے لیے اس کے کمرے میں بستر بچھا دو، کھانے کے بعد اسے آرام کرنا ہو گا۔"

جانے وہ کیسے اس کی بے خواب آنکھوں کی کیفیت پڑھ گئے تھے۔ اس نے تشکر سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

ساری رات آنکھ مچولی میں گزر گئی تھی۔ اسے واقعی شدت سے نیند کی طلب ہو رہی تھی۔ کھانا کھا کر

وہ اپنی چچا زاد کزن رافعہ کی رہنمائی میں ایک صاف ستھرے کمرے میں پہنچادی گئی' خوب صورت سا فوم کا بیڈ' کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ کے پردے تھے' دیواروں کا رنگ ہلکا سبزی مائل تھا۔ جبکہ فرش سرخ اینٹوں کا تھا۔ ایک کونے میں آتش دان دہک رہا تھا۔
گو کہ کمرہ اس کے اسٹینڈرڈ کا نہیں تھا پھر بھی اسے خاصا آرام دہ محسوس ہوا۔ جب وہ سوئی تو پھر رات کی خبر لائی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن ناشتے کے بعد وہ رافعہ کے ساتھ اپنی نمبر دو' نمبر تین نمبر چار تائیوں اور چچی صاحبان کی پورشنز میں گئی' ہر جگہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جس چیز نے زرمل کی حیرت سوا کی تھی وہ ان خواتین کا آپس میں حسن سلوک اور خیر خواہی پر مبنی جذبات تھے۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی سوتن ہیں۔ تیرے میرے بچے کی تفریق بھی نہیں تھی۔ ایک دوسرے کے بچوں کا ایک دوسرے کے مفاد کا ایک دوسرے سے بڑھ کر خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ اس مثالی سلوک سے انگشت بدنداں رہ گئی۔ اسے کہیں سے بھی زبردستی اور مارے باندھے کے حبس زدہ بدصورت رشتوں کی جھلک تک نہ نظر آئی تھی' جس کے متعلق ثریا بیگم کہا کرتی تھیں۔
عباس 'کبریٰ' کا بیٹا تھا مگر اس کی تینوں مائیں کبریٰ سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتی تھیں۔ شام کو وہ گاؤں کا چھوٹا سا چکر لگا کر واپس آئی تو عباس کو نہ پا کر رافعہ سے پوچھ بیٹھی۔
"وہ۔ وہ کہاں ہیں؟" نجانے کیوں اس کا نام لبوں پہ لاتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی۔
"کون؟" رافعہ نے یونہی شرارت سے ہنستے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔
"وہ...... عباس۔" اسے اپنا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "ان کی طبیعت کیسی ہے۔" اسی لمحے سفید براق شلوار قمیص میں وہ ادھر آتا دکھائی دیا۔
"لو جی۔ وہ خود ہی آگئے ہیں۔ بھائی عباس! بھابی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"
اس کے خاصے لیے دیے سنجیدہ و مصروف سے انداز کے باعث سب ہی اس سے فالتو بات کرنے یا بلاوجہ بے تکلف ہونے سے گریز کرتے تھے' سو اس کے آتے ہی رافعہ میدان چھوڑ کر رفوچکر ہو گئی۔
"میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کی تیاری مکمل ہے۔ میں کل صبح نکل رہا ہوں۔ دادا جان کی حالت خاصی سنبھل چکی ہے' ایمرجنسی لیو پر آیا ہوں۔ کل مجھے لازمی شہر پہنچنا ہے۔"
وہ پشت پر ہاتھ باندھے بڑی شاہانہ چال چلتے ہوئے اس کے مقابل آکر اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں پوچھ رہا تھا۔ رافعہ کی لطیف سی "لفظی چھیڑ چھاڑ" نے اس کے یخ بستہ ساکت جذبات کی جھیل میں چنداں کوئی ارتعاش نہ ڈالا تھا۔ مکمل انجان بن جانے کا فن اسے بڑی اچھی طرح آتا تھا۔
دادا جان نے صبح ہی تو زرمل کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے فرمائش کی تھی۔
"بڑی مدت بعد تمہاری شکل میں اپنے شہزاد کی قربت محسوس کی ہے۔ بچے ابھی تم نے جانا نہیں ہے میں کچھ عرصہ تمہیں یہاں چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا ہوں اس آنگن میں۔"
اور سچی بات یہ تھی کہ اس کا دل بھی لگ گیا تھا۔ یہ جگہ اسے بہت دلچسپ سی پر تجسس اور پرسکون محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی بہت کچھ دریافت کرنا باقی رہتا تھا۔
"میں کچھ دن ابھی یہاں رہنا چاہوں گی۔" وہ نظریں اپنے ناخنوں پر جمائے یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواباً گویا ہوئی تھی۔
"اچھا۔" اس کے اس درجہ غیر متوقع جواب پر عباس کا متعجب ہونا فطری تھا۔
"چلو اچھی بات ہے۔ اس ذمہ داری سے تو نجات ملی۔" اپنے مخصوص رکھائی لیے ہوئے انداز میں کہہ

کرو جانے کو مڑا تھا۔

"سنیے' وہ......" اس نے بلا ارادہ پکار لیا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

جانے کیوں اس سے بات کرتے ہوئے اسے پلکیں اٹھانا اور لہجہ بلند رکھنا دشوار تر محسوس ہو رہا تھا۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب جیسے اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔

"میری طبیعت کو کیا ہوا؟" وہ پلٹ کر حد درجہ تحیر سے کہہ رہا تھا۔

"وہ۔" اس نے اضطراب کے عالم میں اپنے ہاتھ مسلنے شروع کر دیے' گردن ہنوز جھکی ہوئی تھی۔ "آپ کل خاصے بے آرام رہے تھے۔ صحیح طرح نیند بھی نہیں لے سکے۔ اس لیے میں سمجھی کہ......" وہ یکدم چپ ہو گئی۔

"بے فکر رہیں۔ دیہاتی لوگ اس درجہ نازک مزاج نہیں ہوا کرتے کہ ذرا ہوا چھونے پر بستر سنبھال لیں۔" اس نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکے۔ انداز میں کاٹ تھی۔ "اس طرح کی چھوٹی موٹی بے آرامی ہمارا کچھ نہیں بگاڑتی۔ ہاں آپ جیسے نازک طبع لوگوں کو البتہ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

وہ طنز کے تیر برسا کر چلتا بنا۔ وہ متاسف نظروں سے اس کی پشت تکتی رہ گئی...... کبھی اس کا گریز اور طعن و تشنیع اس پر اتنا شاق نہیں گزرا تھا۔ دل کی دنیا کیا بدلی تھی جیسے ہر احساس نکل گیا تھا۔

پھر ایک ہفتہ جو اس نے گاؤں میں گزارا اس نے مما کے سکھائے پڑھائے ہر سبق کی نفی کر ڈالی۔ اسے کہیں سے بھی اس خاکے کی جھلک نظر نہ آئی جو ثریا بیگم نے گاؤں اور گاؤں والوں خصوصاً" اپنے خاندان کے بارے میں کھینچ رکھا تھا۔

ٹھیک ہے وہ ہائی سوسائٹی میں موو کرنے کے آداب سے ناآشنا تھے۔ مگر یہ کون سی اتنی بڑی خامی تھی۔ ان میں انسانیت' صلہ رحمی' خوشدلی و خوش مزاجی اور ایک دوسرے کے مسائل میں تعاون کے عملی اظہار کا کس قدر سلیقہ موجود تھا۔ وہ قیمتی کپڑوں' اعلیٰ درجے کے سامان تعیش کے استعمال سے ناواقف تھے مگر صفائی اور نفاست نے اس عیب کو بہت خوب صورتی سے چھپا لیا تھا۔

انہیں لگی لپٹی نہیں آتی تھی۔ خوشامد نہیں کرتے تھے۔ بے دریغ منہ پر بات کرتے تھے مگر اس رکھ رکھاؤ سے کہ دشمن کا دل بھی نہ دکھے۔ دکھ دے کر سہلانے کا ہنر بھی بخوبی آتا تھا۔ انہوں نے تین تین چار چار شادیاں رچا رکھی تھیں تو کیا فرق پڑتا تھا۔ اتنے بڑے خاندان میں مثالی یگانگت اور بھائی چارے کے اظہار نے اس کمزوری پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک ہفتے بعد عباس واپس لوٹا تو اس کو روبرو پا کر زرمل کے چہرے پر جو بے ساختہ رنگ بکھرے تھے' اس نے عباس کے ساتھ ساتھ خود زرمل کو بھی حیرانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ عباس کے ساتھ کبریٰ' صبیحہ' ایاز اور سعد بھی تھے۔

"مجھے تو جب بھائی نے بتایا کہ آپ گاؤں میں ہیں تو دل چاہا اڑ کر پہنچ جاؤں۔ پیپرز دینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ بہت شوق تھا اپنی بھابی سے ملنے' انہیں دیکھنے' ان سے باتیں کرنے کا۔"

صبیحہ بے اختیار والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی تھی۔ جوش مسرت سے اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔

"آپ تو امی کے کھینچے گئے نقشے سے بھی کہیں زیادہ حسین ہیں۔ اف کیا بتاؤں کتنی خوشی ہو رہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر' ہم لوگ تو ترس کر رہ گئے تھے آپ کو اپنے درمیان دیکھنے کو۔"

صبیحہ اپنے بڑے بھائی کے برعکس خاصی باتونی اور سادہ مزاج ثابت ہو رہی تھی۔

کبریٰ خانم کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کلیجے میں بھر لیں۔ اسے اپنے آنگن میں اتنے خوش باش اور مصروف و مگن انداز میں پھرتے دیکھ کر ایک ٹھنڈک سی دل میں اتر گئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے کل گاؤں میں میلہ لگے گا۔ میں
لے امتحان دے کر بے قرار ہو کر بھاگی آئی ہوں۔
اور سرمد تو کتنے دنوں سے بے تاب ہو رہے تھے۔"
صبیحہ کھلکھلاتے ہوئے بتا رہی تھی۔
"میلے میں کیا ہوتا ہے؟" اس نے اس درجہ سادگی
سے پوچھا کہ صبیحہ کے ساتھ ساتھ کبریٰ کو بھی ہنسی آ
گئی۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے بھئی۔ بھابھی کیا جانیں میلہ
کس بلا کا نام ہے۔ ساری زندگی ملک سے باہر گزاری
ہے۔" ایاز نے جھٹ سے اس کی حمایت کی تھی۔
"میلے والے دن خوب دکانیں سجتی ہیں، مٹھائی
کی، کھلونوں اور ٹافیوں وغیرہ کی، اس کے علاوہ
سرکس اور تھیٹر بھی لگتا ہے، قسم قسم کے جھولے بھی
لگتے ہیں، اس میلے میں بچے بوڑھے، جوان، خواتین
سب ہی خوش ہو کر شرکت کرتے ہیں اور لطف اندوز
ہوتے ہیں۔" کبریٰ نے ساری تفصیل بہو کو سمجھا دی

"پھر تو میں بھی دیکھنے چلوں گی۔" اس کے اندر
بچوں کا سا اشتیاق امڈ آیا۔
"ہاں ضرور بچے۔" کبریٰ خوش ہو کر اس کے بالوں
میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔
"اچھا کل کی کل دیکھی جائے گی فی الحال زری
بھابھی کو ہمارے حوالے کر دیں، ہم لوگ جنگل میں
شکار کرنے چلیں گے شام کو، کیوں بھابی!"
شکار کا تو اسے بھی بہت شوق تھا۔ ایاز کی تجویز پر
اس نے فوراً "ہاں" بھرلی تھی۔
"دریا پہ چلیں گی بھابی؟ یہاں سے کچھ فاصلے پہ
دریا راوی بہتا ہے جسے بار شن بھی کہا جاتا ہے بہت مزا
آئے گا۔" سرمد نے اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔
"اوہو۔ کیا تم لوگوں نے بچی کو" وختا ڈال رکھا ہے
کبریٰ کو زرمل کے یکدم بگڑ جانے والے موڈ کی خبر
تھی۔ سو پیش بندی کے طور پر بچوں کو ڈانٹنے لگیں۔
"بھابی جو ہو گئیں ہماری۔" اور وہ جواب میں بے
ساختہ مسکرا دی۔

عباس کے چہرے پہ حیرت کے بادل منڈلانے لگے

"بھابی" کہہ کر مخاطب کرنے پر وہ قطعی نہیں
جھلائی تھی۔ چہرے پر دبی دبی دلچسپ سی مسکراہٹ
تھی اور آنکھوں میں اپنائیت آمیز نرمی کی واضح چمک۔
"ایسا انقلاب کیوں کر رونما ہو سکتا ہے؟" وہ خاصا
الجھ سا گیا تھا۔
"آپ کی والدہ صاحبہ کا پیغام ملا ہے، انہوں نے
فوری طور پر آپ کو رابطہ کرنے کی تاکید کی ہے۔"
شام میں جب وہ ایاز کے ساتھ جنگل میں بٹیر، تیتر اور
فاختاؤں کے شکار کے شوق میں روانہ ہو رہی تھی۔ تو
اسی دوران عباس نے ادھر آکر اپنے مخصوص سرد سے
انداز میں اطلاع دی۔ فون گاؤں تک نہیں پہنچا تھا۔
ضروری اطلاع کے لیے نزدیکی قصبے میں موجود چھوٹے
چچا کے جنرل اسٹور کا نمبر کام آتا تھا۔
"بیٹی! اگر تمہارا دل زیادہ اداس نہیں ہو رہا تو بقرعید
ہمارے یہاں کر کے چلی جانا۔ شہزاد بھائی اور ثریا بہن
بھی اگر راضی ہو جائیں یہاں آکر قربانی دینے کے لیے
تو تمہارے دادا جان اپنی پسند کی خوشی دیکھ لیں گے۔"
جب وہ کبریٰ کے اصرار پر اسے نزدیکی قصبے ماں
سے فون پر بات کروانے کے لیے ہمراہ لے جانے پر تیار
ہوا تو چلتے چلتے کبریٰ نے بڑی چاہ اور آرزو سے التجا کی
تھی۔
"زری! واٹس گوئنگ آن ویری مائی ڈیر۔" مما نے
سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی قدرے ناخوشگوار سے
بے تاب لہجے میں پوچھ ڈالا تھا۔ "بھئی کہاں رہ گئیں
تم، مجھے پیرس سے آئے ہوئے بھی تین دن گزر گئے
ہیں اور تم ابھی تک وہیں ہو۔ اس حبس زدہ پولیوٹڈ
ایٹ موسفیر میں۔"
وہ حد درجہ متحیر سی کہہ رہی تھیں۔ "ان تنگ نظر
ال منرڈ لوگوں کے ساتھ۔" مما کی حیرت ختم ہونے کا
نام نہیں لے رہی تھی۔
"ایسی کوئی بات نہیں مما!" اسے پہلی مرتبہ ماں کا
انداز تنگ آمیز اور غیر منصفانہ لگا تھا۔ "میں یہاں

ٹھیک ٹھاک انجوائے کر رہی ہوں اور آپ کو بتانا یہ چاہ رہی تھی کہ میں یہ عید یہیں سب کزنز کے ساتھ اور دادا جان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"
اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکلے تھے گویا ثریا بیگم کے اعصاب پر کوئی طاقتور بم پھٹا تھا۔
"واٹ۔ تم ہوش میں تو ہو زری۔" ان کا استعجابیہ انداز یک بیک بھڑک کر شرربار ہو گیا۔ پھر حسب سابق "رفع شر" کے لیے وہ پچھلے لیکچر دہرانے لگیں جنہیں وہ چپ چاپ سنتی رہی۔
"وہ سب تو ٹھیک ہے مما! مگر کچھ چینج بھی ہونا چاہیے لائف میں۔"
وہ پہلی بار ان سے اختلاف کرتے ہوئے قدرے الجھ کر گویا ہوئی تھی۔
"آپ لوگ بھلا کیوں نہیں یہاں آسکتے؟"
"بے کار باتیں مت کرو زرمل۔" انہوں نے برہم ہو کر ڈانٹا۔ "اس ایک ہفتے میں تمہیں سب اگلا پچھلا بھول گیا۔ میں اسی لیے نہیں چاہتی تھی ان لوگوں سے میل ملاپ بڑھانا۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے لبھا پرچا کے مطلب نکالنا تو خوب جانتے ہیں یہ۔ آ گئیں ناں آخر تم ان کے جال میں۔" ان کے لہجے میں نمایاں تلخی تھی۔
"فار گاڈ سیک مما!" وہ چڑ سی گئی۔ "آپ کو میری اتنی سی خوشی منظور نہیں۔" وہ ناراض سے انداز میں بسوری مگر ادھر کچھ اثر نہیں ہوا۔
"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں تمہاری اس خوشی کے پیچھے کیا خواہش چھپی ہوئی ہے۔ ایسی بچی بھی نہیں ہوں۔" وہ دانت پیس کر جوابا" قہر آلود لہجے میں بولی تھیں۔
خفت سے زرمل کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔
"بہرحال ہم لوگ عید پر گاؤں نہیں آ رہے' تمہاری مرضی ہے اب ہمارے بغیر عید کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے اور اگر واپسی کا موڈ ہو تو اطلاع کر دینا۔ میں ڈرائیور بھجوا دوں گی۔" انہوں نے بے لچک انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

زرمل گم صم سے انداز میں فون ہاتھ میں لیے کھڑی رہ گئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھا ... اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ اور چہرے کے تاثرات بخوبی ملاحظہ کر سکتا تھا۔ وہ ساری گفتگو سن چکا تھا اور دل ہی دل میں حد درجہ متعجب بھی تھا۔ تاہم پوچھنا اس کی عادت میں شامل نہیں تھا۔ سو اسی مخصوص ... انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ بقر عید کے بعد لاہور چلیں گے یا..."
کبری کی ہدایت کے مطابق قصبے سے فون کروا کے وہ اسے واپس جنگل چھوڑنے جا رہا تھا جہاں ایاز لوگ پہلے سے موجود تھے۔ راستے میں زرمل نے یونہی ... توڑنے کو اس کے سرد و سپاٹ تاثرات سے سجے چہرے پر اک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر مدھم سے لہجے میں پوچھا ...
"یا کہاں؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ظاہر ہے لاہور ہی جانا ہے۔"
زرمل اس کے مخصوص اکل کھرے لہجے پر گہری سانس لے کر باہر دیکھنے لگی۔ سنبل' کیکر' بکائن' شیشم اور سفیدے کے لہراتے ہوئے سرسبز ثمربار درختوں کی جھلک دور سے دکھائی دے رہی تھی۔
"کیا یہ کبھی بھی اپنا طرز عمل نہیں بدلیں گے۔" اس کے دل پر بہت سا بوجھ آن پڑا۔ اس کے دماغ میں صبیحہ کی باتیں گونج رہی تھیں جو وہ سہ پہر کو اس کے ہمراہ ڈیری فارم میں قربانی کے جانور دیکھنے کے لیے روانہ ہوتے ہوئے کی تھیں۔ وہ بظاہر بہت کھلنڈری اور شوخ طبع نظر آتی تھی مگر اس کی ذہنی اپروچ اپنے بھائی سے بہت میل کھاتی تھی۔ ہو بہو وہی گہرائی' حقیقت پسندی اور ٹھوس پن لیے ہوئے۔
"ہم لوگ تبدیلی چاہتے ہیں بھابھی! مگر بتدریج... جو چیز اچانک ہو جائے اس کی بقا کی معیاد بہت مختصر ہو جایا کرتی ہے کوئی واقعہ ایک دم نہیں ہوا کرتا۔ آپ نے نو دولتیوں کو دیکھا ہو گا۔ بے صبرے' بے ڈھب اور کم فہم' دور سے ہی ان کے راز فاش ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اوقات کھل جاتی ہے۔ ہمیں کوئی جلدی

بس ہے۔ اک یقین و اطمینان کی سی کیفیت میں بتدریج آگہی پانے کا عمل ہمیں اچھا لگتا ہے۔ دیکھیے ضروری نہیں ہے کہ "انتہا" ہمیشہ ہی خرابی کی ضمانت کہلائے اور ہم مزید کھوجے بغیر اس کو جوں کا توں چھوڑ کر چل نکلیں۔ بھئی درمیانی راستہ بھی تو اختیار کیا جا سکتا ہے ناں۔ اس "انتہا" کو ارتقاء کے عمل سے متوازن بنا کے قابل قبول حالت میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ نہ گاؤں کے گھٹے دبے ماحول میں کچھ خرابی ہوتی ہے نہ شہروں کی بے باکی اور تیز رفتاری ایسی قابل مذمت ہوتی ہے۔ شہر بھی اچھے، بن بھی اچھے بشرطیکہ دل اچھے ہوں۔ ہر ماحول کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ ہم لوگوں نے دونوں کو "علاقہ غیر" کی سی حیثیت دے رکھی ہے حالانکہ درمیان میں پل بنا کے رابطہ و رشتہ بحال بھی رکھا جا سکتا ہے۔

اور یہ پل بنانے کا کام عباس بھائی کی سرکردگی میں ہم لوگوں نے شروع کر دیا ہے۔ بھئی شہروں کی بے باکی اور جاہ پسندی نہ لو، وہاں کی تعلیم و تہذیب اور وقت کی اہمیت لے لو، اور شہر کی مصنوعی معاشرتی زندگی کے بجائے گاؤں کی اپنائیت و یگانگت بھائی چارے اور پر خلوص تعاون کے جذبات سے گندھا طرز عمل اپنا لو۔ رابطہ، واسطہ رکھا جا سکتا ہے بھائی! دونوں جانب کی اچھی اور مفید مکمل چیزیں اپنا لو، باقی نظر انداز کر دو۔ اس طرح نہ تو شہر سے آنے والوں کو گاؤں آٹھویں صدی کا [illegible] لگیں گے اور نہ گاؤں سے آنے والوں کی آنکھیں شہروں کی چمکتی دمکتی رنگوں میں لپٹی تیز رفتار زندگی دیکھ کر چندھیائیں گی۔ دونوں اطراف سے فریقین کو درجہ قبولیت اور ایڈجسٹمنٹ کے لیے راہ ہموار ملے گی تو فاصلے خود بخود سمٹ جائیں گے۔"

"ہاں رابطہ و رشتہ بحال رکھا جا سکتا ہے۔" وہ کن انکھیوں سے عباس کو دیکھتی دل میں اعتراف کر رہی تھی ہاں تم مجھے قبول ہو۔ مگر یہ اعتبار بھی تو کرے ناں۔" اسے بے ساختہ نوشی گیلانی کا ایک شعر یاد آ گیا۔

بے شک نہ میرے ساتھ سفر اختیار کر

اے میرے بدگمان! میرا اعتبار کر!

اعتبار دلانا کچھ آسان بھی نہیں ہوا کرتا۔ خصوصاً اس جگہ جہاں گرد بدگمانی آج کی بات نہ ہو برسوں پر محیط ہو، اس رات اس کے طرز عمل نے زریل کے دل سے بہت سارے شکوک و شبہات دور کر دیے تھے۔ ایسا مضبوط قوت ارادی والا، نفس کا اس حد تک محتسب بندہ یقیناً ہوس گیری کے جذبات سے مبرا ہے۔ مگر پھر یہ دو دو تین تین شادیاں، وہ الجھ سی گئی۔

"سنیے۔ آپ کے یہاں اس قدر شادیاں کرنے کا رواج کیوں ہے؟" اس کے یکدم بول پڑنے پر عباس نے یونہی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی پست سی ہتھیار پھینک دینے والی کیفیت نے عباس کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

"اس سوال کا جواب دینا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔" وہ سر جھٹک کر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا لہجے میں وہی بے نیازی وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

"اگر دے دیں گے تو مجھ پر احسان ہی ہو گا۔" وہ اپنا آف ہوتا موڈ چھپا نہیں سکی۔ ناراض سے انداز میں کہتے ایک شاکی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

"ایک تو صاحب کی انا کے بنڈل ختم نہیں ہوتے۔" وہ کوفت زدہ سی سوچ رہی تھی۔

"اور اگر نہ دوں تو۔" اس کو زچ کرنے میں عباس کی غالباً کسی حس کو خاصی تسکین پہنچ رہی تھی۔

"تو بھی میں آپ کا کیا بگاڑ لوں گی؟" اس کے اڑیل لہجے پر تھکے تھکے انداز میں کہہ کر اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"بھئی، اب اس درجہ غمگین ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔" اس کے ڈھیلے ڈھالے انداز پر یونہی ہلکے پھلکے انداز میں کہہ بیٹھا۔ "بتائے دیتے ہیں بیگم گو کہ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کوئی ہمیں نفس پرست سمجھتا ہے تو ہزار بار سمجھا کرے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بہت زیادہ مجبوری نہ ہو تو خاندان سے باہر شادیاں کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ہمارے یہاں

خدا کی قدرت تھی یا تقدیر کا لکھا کہ آج سے بہت پہلے لڑکیوں کی شرح پیدائش لڑکوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی' چونکہ ایک آدھ صدی پہلے خاندان سے باہر شادی کرنے کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس لیے خاندان کی بہت سی لڑکیاں شادی سے محروم رہ جاتی تھیں۔ وہ تاعمر کنواری بیٹھی رہتیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے باقی خاندانوں میں خصوصاً" قبائلی علاقوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بے جوڑ شادیاں کردی جاتی ہیں۔ بیس سالہ لڑکی کا پانچ سالہ دولہا یا پھر اس کے الٹ کردیا جاتا ہے۔

مگر ہمارے آباؤ اجداد اس رسم کے سخت خلاف تھے' ایسے میں جب دادا جان کا دور آیا تو انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ بجائے اس کے کہ چند ایک لڑکیاں شادی شدہ زندگی کے سکھ دیکھیں اور باقی کی شریک سفر میسر نہ آنے پر تاعمر حسرت و ملال سے ان کے آباد گھروں کی رونقیں دیکھتے ہوئے سلگ سلگ کر محروم و تشنہ زندگی گزاریں' جان کا روگ لگالیں۔ اس کا حقیقت پسندانہ حل یہ نکلا..... کہ خاندان کا ہر مرد ایک سے زائد شادی کرلے' اس طرح چند ایک لڑکیوں سے امتیازی سلوک کا جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا اور کنواری رہ جانے والی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ ہونے سے بھی بچ جائیں گی۔

سو خاندانی بقا و مسرت کے لیے یہاں کے مردوں نے شرعی حدود کے اندر تین یا چار شادیاں کر رکھی ہیں ہمارے یہاں خدا کا فضل ہے۔ نان نفقے گھربار کی معاشی ذمہ داری پوری طرح سے نبھا رہے ہیں۔ چاروں سے شرع کی رو سے انصاف روا رکھنے کی بھی پوری کوشش کی جاتی ہے' اس کا عملی مظاہرہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ یہاں کوئی سگا یا سوتیلا نہیں ہے کوئی سوتن یا رقیب نہیں ہے۔ یہ ایک سمجھوتا ہے خاندان کے تمام مرد و زن خاندان کی یک جہتی اور خوشی کے لیے بہ رضا و رغبت قبول کیے ہوئے ہیں۔ اب تو پھر تناسب میں کافی بہتری ہو گئی ہے۔ پرانے زمانے میں اگر ایک گھر میں دو لڑکے ہوتے تھے تو سات لڑکیاں مگر یہ خدا کی دین ہے' فطرت کے کاموں میں کسی کا دخل تو نہیں ہو سکتا' اسی لیے فطری ایڈجسٹمنٹ کے لیے دادا جان کے زمانے سے ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج پروان چڑھا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں اس سے بہتر منصفانہ اور دانشمندانہ فیصلہ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس دور کے حالات کے مطابق۔"

"اوہ!" بہت توجہ اور انہماک سے سنتی ہوئی زرمل اس انکشاف پر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی دھڑا دھڑ شادیاں کرنے اور خصوصاً" خواتین کے آپس کے خیر خواہانہ اور ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ سلوک کے پیچھے یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

"واقعی ان حالات میں دادا جان کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ورنہ جن خاندانوں میں شادیاں باہر کرنے کا رواج نہیں ہوتا وہاں تاعمر کنوارا رکھنے یا کم سن سے بے جوڑ نکاح پڑھا دینے جیسے ظالمانہ رواج پروان چڑھائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے دادا جان کی حکمت عملی ان کے مقابلے میں بہت فطری اور شرعی تھی۔"

اور اس کو تاریخی تائید بھی حاصل تھی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جب ایک ایسا وقت آیا تھا جب خواتین کی تعداد مردوں سے بڑھ گئی تھی تو مصلحت کے تحت ایک مرد کے نکاح میں تین تین چار چار خواتین آگئی تھیں۔

"اور مما کو دیکھو' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کو نفس پرستی کا نام دے ڈالا۔ غالباً" ان کی پوزیسو نیچر شوہر کی اس تقسیم کو برداشت نہیں کر سکی تھی اسی لیے پاپا کو خاندان سے نکال کر لے گئیں اور مجھ میں گاؤں والوں کے خلاف اس درجہ زہر بھر دیا کہ ہم پلٹ نہ سکیں۔"

مچھلیوں کی مخصوص بساند نشاندہی کر رہی تھی کہ وہ لوگ فش فارم سے گزر رہے ہیں۔

"سنیے!" اس نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھا کر متذبذب سے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے خاصی ہچکچاہٹ کے عالم میں اسے پکارا۔ اس کے لیے یہ واضح شکست تھی۔ جسے عباس کا نکتہ رس ذہن فوراً

محسوس کر چکا تھا۔ تاہم وہ بے حس بنا بیٹھا رہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ۔" وہ جھجک کر سر جھکا کر گود میں رکھے ہاتھ مسلنے لگی۔ اپنا مفہوم سمجھانے میں کس درجہ دشواری محسوس کر رہی تھی۔

"کہ ہم ایک دوسرے کو۔" وہ پھر رک گئی۔ "سابقہ تلخیاں بھلا کر موجودہ حیثیت سے قبول کر لیں۔" بدقت تمام وہ کہہ پائی تھی۔

عباس کتنی ہی دیر سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ زرمل کا سر جھکا ہوا تھا۔

"محترمہ!" کتنی دیر بعد بالآخر وہ بولا تو لہجے میں کسی قسم کی "قبولیت" کا شائبہ تک نہ تھا۔

"آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی ہیں یہاں آکر بھی کیا والدہ صاحبہ کے "اقوال زریں" بھول گئیں' اپنے والد صاحب کے خوابوں کی تعبیر نہ دیں گی آپ۔ اتنے بڑے بزنس مین کی اکلوتی طرح دار حسین بیٹی۔ کیا چیز نہیں ہے آپ کی مٹھی میں' انسانوں سمیت۔" وہ زہریلے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں سب کچھ فیس کر سکتی ہوں 'تم قبولیت' کی سند تو دے کر دیکھو 'کوئی جگنو' کوئی ستارہ کوئی دریچہ کچھ تو ہو۔" وہ کرب سے سوچ رہی تھی۔

پھر وہ تمام راستے کچھ نہیں بولی۔ جنگل قریب آچکا تھا۔ ایاز اور سرمد دور سے ہاتھ ہلا رہے تھے' وہ چپ چاپ گاڑی سے اتر گئی۔ وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

زرمل کا انداز بہت چونکا دینے والا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے عباس بے اختیار اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پروین شاکر کی نظم "کن رس" یاد آرہی تھی۔

یہ جھکی جھکی آنکھیں
یہ رکا رکا لہجہ
لب پہ بار بار آکے
ٹوٹتا ہوا فقرہ!
گرد میں اٹی پلکیں
دھوپ سے تپا چہرہ
سر جھکائے آیا ہے
ایک عمر کا بھولا
دل بیزار کہتا ہے
ہاتھ تھام لوں اس کا
چوم لوں یہ پیشانی
لوٹنے نہ دوں تنہا
کوئی دل سے کہتا ہے
سارے حرف جھوٹے ہیں
اعتبار مت کرنا
اعتبار مت کرنا!

☼ ☼ ☼

بقر عید پر اس نے بہت انجوائے کیا۔ اسے پہلی بار شدت سے محسوس ہوا کہ تہوار کی سچی اور بے پایاں خوشیاں اپنوں کے سنگ' اپنوں کے ہنستے کھلکھلاتے چہروں کے ساتھ منسلک ہوتی ہیں۔ عید کے بعد اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ دادا جان کی صحت کافی بہتر تھی زمین کے کاغذات بنوا کر وہ کب کے اس کے سپرد کر چکے تھے۔ جانے سے ایک دن قبل انہوں نے اسے بلوایا۔ کبریٰ خانم اور تایا جان بھی ادھر ہی تھے۔

"دیکھو بچے! اب ہم عمر کی اس اسٹیج پر ہیں جب انسان حکم دینے فرمان جاری کرنے کے بجائے درخواست گزاری اور التجاؤں پر اتر آتا ہے۔ سو ہم تم سے درخواست ہی کر سکتے ہیں کہ خاندان کی یک جہتی کے لیے اگر تم ہمارا برسوں پہلے کیا ہوا فیصلہ بہ رضا و رغبت قبول کر کے ہمیں خوشی دے سکو تو اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے ہمیں کچھ چاہیے بھی نہیں۔ ہم نے دل پہ پتھر رکھ کے بہت صبر سے شہزاد کی جدائی برداشت کی ہے۔ تمہاری آمد اور تمہاری اتنی پیاری نیک عادات نے ہمارے بہت سارے زخم بھر دیے ہیں۔ کیا تم ہمارے لیے ہماری خواہش کے پیش نظر اسٹینڈ لے سکتی ہو؟"

اس نے سر جھکا لیا اور پاؤں کے انگوٹھے سے فرش پر بچھی دری کا کونا مسلنے لگی۔ انہوں نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"عباس اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ ایک معزز پیشے سے وابستہ ہے' معاشی لحاظ سے بھی قطعی آسودہ ہے' پھر لاہور میں اپنا ذاتی گھر بنا چکا ہے۔ سارے معاشرتی ادب آداب سے واقف ہے۔ بیوی کو بھی ظاہر ہے لاہور میں ہی رکھے گا۔ تمہیں کسی قسم کی "تکلیف دہ تبدیلی" کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہیں اسی شہر میں' اسی ماحول میں رہو گی۔ ہاں دل چاہے تو ادھر کا چکر لگا لیا کرنا مہینے دو مہینے بعد۔ عباس میں تھوڑی سی ضد اور انا ہے مگر وہ دل کا بہت اچھا ہے تعاون کرنے اور خیال رکھنے والا ہے۔"

"مگر دادا جان! وہ..." وہ خوفزدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ "یہ دوسری اور تیسری شادی بھی کریں گے کیا؟" وہ جس طرح سراسیمہ ہو کر بے ساختہ بول پڑی تھی اس نے حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹ کے پھول کھلا دیے۔ دادا جان نے ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

"ارے بھئی' ہم اپنی اتنی نازک مزاج سی پوتی کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ بچے! وہ اس دور کے فیصلے تھے جب واقعی اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارا خاندان اتنا پھیل گیا ہے کہ جوڑ تلاش کرنا آسان ہو گیا ہے۔ تمہارے بڑے تایا اور چھوٹی پھپھو کے دونوں بیٹوں کی شادیاں تین چار سال پہلے ہوئی ہیں' دیکھ لو' ان کی دوسری شادی نہیں ہوئی۔ ارے بچے! یہ کوئی تفریح تھوڑا ہے۔ یہ تو مصلحت تھی اور اب جو بلاوجہ ایسا کرے گا تو ہم اس کو الٹا نہ لٹکا دیں گے پھر عباس کے جوڑ کی تو کوئی ہے بھی نہیں۔" وہ شگفتگی سے مسکرائے تھے۔

اب وہ سوچ رہی تھی۔ "پاپا تو سدا سے میرے حامی رہے ہیں۔ ماما کا مزاج بے لچک ہے مگر کیا ہوا۔ میں بھی تو انہی کی بیٹی ہوں۔ دشوار ضرور ہے مگر بہر حال وہ مان جائیں گی۔"

رخصت ہوتے سمے اس نے دادا جان کو یقین دلا دیا تھا۔ رخصتی مما پاپا کو راضی کرنے کے بعد طے پائی تھی مگر ادھر سے تو قبولیت کی کچھ سند نہیں مل رہی۔

واپسی کے سفر کے دوران وہ چور نظروں سے اسے اپنے مخصوص "آتش فشانی" موڈ میں ڈرائیونگ کرتے دیکھ کر مایوسی سے سوچ رہی تھی۔

"جو ایک بار یہ کہہ دیں' ہاں تم مجھے قبول ہو۔ تو پھر مما سے اپنا فیصلہ منوانے کا دشوار تر مرحلہ کس قدر سہل ہو جائے۔ خبر تو ان کو بھی ہو گئی ہو گی۔ آخر دادا جان اور کبریٰ آنٹی نے بتایا تو ہو گا۔ مگر یہ بہت انا پرست اور مغرور' خود سے نہیں پوچھیں گے۔"

"سنیے! شرمندگی اور پسپائی کا اظہار کس زبان میں آپ تک پہنچایا جائے جو آپ کی سمجھ میں آ جائے۔"

"پیار کی زبان میں۔" اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے روک دی تھی۔

"جی ای۔" اس کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ آنکھیں پھاڑے بھونچکا سی اسے دیکھنے لگی جس کے ہونٹوں میں ایک خوب صورت سا تبسم دبا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا کھلا کھلا روشن چہرہ آنکھوں سے برستی ازلی جارحیت اور قہر ساماں تاثرات بھی کہیں پیچھے چلے گئے تھے' وہاں ایک شوخی اور اپنائیت آمیز شرارتی چمک تھی۔ وہ سٹپٹا کر باہر دیکھنے لگی اور پھر اسے دوسرا جھٹکا لگا۔ گاڑی اس وقت مالٹوں کے باغ کے پاس کھڑی تھی جس سے کچھ فاصلے پر وہ گاؤں تھا۔ وہی گاؤں جہاں انہوں نے رات گزاری تھی۔ برستی کڑکتی خدشات اور طوفان میں گھری رات اور اس پہ ستم ٹیپ ریکارڈر پر بجتا حسب حال گیت۔

عمر بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
آگ پانی میں لگاتے ہوئے جذبات کی رات

"آؤ ماسی زہراں اور غلام رسول بھائی سے مل لیں۔ اپنی اصلی حیثیت میں۔" اس نے گویا گاڑی روکنے کی وجہ بتائی تھی۔ اس کی چمکتی ہوئی نظروں میں چھپی معنی خیز سی شرارت بے ساختہ اسے گلگوں کر گئی۔ وہ چہرہ موڑ کر باہر باغ میں لگے تازہ موٹے موٹے مالٹوں کو دیکھنے لگی۔

عباس نے اپنے شرعی استحقاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے دونوں مخملیں سفید ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں کی فولادی گرفت میں لے لیے۔

"یاد نہیں۔ اس رات ہمیں کمرے میں تنہائی سونپتے ہوئے جاتے سمے انہوں نے تمہیں کیا دعا دی تھی۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر یاد دلا رہا تھا۔ "اللہ جلد تمہاری گود ہری کرے۔" زرمل کو بے ساختہ یاد آگیا اور اس کے ساتھ ہی شرم و حیا کا زبردست سا ریلا اسے خود میں سمٹ جانے پر مجبور کر گیا۔

"سنیے!" اسے ٹوکنے کو حیا آمیز خفگی سے بات شروع کرنا چاہی مگر اس نے موقعہ نہیں دیا۔

"سنائیے۔ ویسے کچھ عرصہ کی بات ہے پھر آپ کے طرز تخاطب کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ 'سنیے' کی جگہ منے کے ابا' گڈو کے پاپا' پنکی کے ڈیڈی' ہے ناں" وہ شرارت سے جھکا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کم از کم سات لڑکوں کے والدین بننا چاہیے تاکہ خاندان میں لڑکوں کی رہی سہی کمی بھی پوری ہو جائے۔ دادا جان خوش ہو جائیں گے۔ آخر تم خاندانی مسئلہ حل کرو گی' ویسے میرا نام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔"

"دیکھیں! آپ بہت بدتمیز ہو رہے ہیں۔ گاڑی چلائیں۔" اس کا بے لگام لہجہ اور اس پر سوا بہکتی مچلتی وارفتہ نظریں اس کے حواس پر بری طرح شرم غالب آ گئی۔ اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑانے کی سعی کی تھی۔

اس چمکتے دمکتے دن پر غصہ آرہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا جو وہی طوفانی موسم ہوتا' وہی صورت حال' وہی رات' وہی تنہائی اور....."

اس نے رک کر معنی خیز نگاہ اس پر ڈالی۔ "ویسے کیا خیال ہے یار! کیوں نہ آج ماسی کے مہمان بن جائیں۔ رات گزار کر صبح سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ ہاں مگر اب کے تم مجھ سے شرافت کی توقع مت رکھنا۔ پچھلی بار تو یونہی رات برباد کر ڈالی تھی۔" وہ چھیڑ رہا تھا۔

زرمل بے اختیار سرخ پڑ گئی۔

"دیکھیے' آپ شرافت سے گاڑی چلائیں۔ ورنہ میں دادا جان سے شکایت کردوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ وہ فوراً" سے پیشتر تمہاری رخصتی کا انتظام کر ڈالیں گے۔ میرے لیے تو عین مسرت کا مقام ہوگا۔ مجھ پر تو ویسے بھی تمہاری مما کے راضی ہونے تک کا طویل عرصہ بہت بھاری گزرے گا۔"

وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر اب گاڑی چلانے لگا تھا اور زرمل کے اندر دور دور تک سرشاری پھول کھلانے لگی۔ بالآخر اس نے واضح طور پر قبولیت کی سند دے دی تھی۔

واپسی کا یہ سفر کس درجہ مختلف خوشگوار اور دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ امجد اسلام امجد کے اس شعر کی طرح

ماند پڑتے ہوئے منظروں کی قسم
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے
اپنے تاروں سے کہنا' چمکتے رہیں
میری آنکھوں میں' اک رتجگا اور ہے

اسے یاد آیا۔ ابھی مما کو منانے کا مشکل ترین مرحلہ باقی ہے۔ واقعی اک رتجگا اور باقی ہے مگر اب کچھ غم نہیں۔ اس قدر بھرپور سپورٹ کے ساتھ ہر کٹھن منزل طے کی جاسکتی ہے۔

جب من چاہا سفر مل جائے اور اقرار کرلے کہ "ہاں تم مجھے قبول ہو۔" تو کیا اس کے لیے راستے کی دشواریوں سے لڑنا بھی ہم قبول نہیں کرسکتے؟ ہاں ہر شے ہمیں قبول ہے اب۔ سفر تیزی سے تمام ہو رہا تھا۔